

# ایمان کے

صدیوں کی مسافت طے کر کے آئی ہوں۔ میرا انگ  
اگ ٹھکن زدہ تھا۔ آنکھیں گویا رو کر تھک چکی  
تھیں۔

میں بھلا کس کا مریبان پکڑتی، کسے مجرم ٹھہراتی۔  
میری بات پر بھلا کس نے ایمان لانا تھا۔ میں ماما کو کچھ  
بتا رہی تو نہیں پائی تھی۔ بھلا بتاتی بھی کیا؟ یہ میرا پناہی تو  
فیصلہ تھا۔ ماما نے مجھے کس قدر سمجھایا تھا مگر میں اپنی  
سادگی میں کچھ سمجھ ہی نہیں پائی۔

مجھے چرے کا دعوت بھی نہیں رہا تھا مگر میں  
حیران تھی کہ بعض لوگ کس طرح صورت بدل  
کر سامنے آتے ہیں۔ ہر دفعہ ان کا نیا چہرہ نظر آتا تھا۔

باہر چمکتی دھوپ کا راج تھا۔ گرم لو کے تھیں  
نے گویا ہر شے کو جھٹکا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے کھڑکی  
کے پردے ہٹا کر باہر دیکھا۔ یوں لگ رہا تھا گویا میرا دل  
سینہ توڑ کر گرم اور بھلا سونے والی زمین سے لپٹ لپٹ  
کر مین کر رہا ہے۔

ابھی کچھ دیر پہلے ماما مجھے بہت سمجھاتی، بھاتی رہی  
تھیں۔ زندگی کے تھیب و فراز، اتار چڑھاؤ۔ مگر میں  
انہیں بھلا کیا بتاتی۔ میرا دل تو آتش کہ دینا ہوا تھا۔ میں  
مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بنا دی گئی تھی۔ میرے  
لیے اس حقیقت کو تسلیم کرنا خود کشی کے برابر تھا۔  
آج آنکھوں دن تھا اور مجھے لگتا تھا گویا میں

## مکمل ناول



ایسا چوہ کسی بھی سادہ دل رکھنے والے کو دھوکے میں مبتلا کر سکتا تھا۔

میری سادگی میرے لیے بیش نقصان کا باعث بنی تھی مگر اس دفعہ تو میرے دل کا نقصان ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا گویا کسی نے میرا دل فوج کر کسی پتھر کے نیچے رکھ کر پھینک دیا ہے۔

مجھے اس سے بے تشاہدیت جو ہو چکی تھی اور میں نے بھی سوچائی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے بھی اس طرح کسی اور کی جیوتنی داستان سن کر بدگمان ہو جائے گا۔ اس کی بدگمانی کے کھوٹے میرے دل میں تیز سے اندر سے تھے۔

مگر میرے ساتھ بھلا ہوا کیا تھا ؟



دنوں میں میرے ستارے گردش میں تھے۔ مجھے نہانے کس منٹوں گھڑی میں دھڑلے سے ڈپڈپہاؤں خود بخود ٹھیک ہو گیا تھا اور مانتا کہ یہ منٹوں خبر بغیر کسی دشواری کے پہنچ چکی تھی۔ سدا کی کبھی فطرت اور ہلکی کم طرف جانیے کے جگہ بیت میں میرے یعنی ساجد مراد کے متعلق ”خبر بھلا کیسے فہم رکتی تھی میرا کو توں کھڑا کر میری شان دار کامیابی کی اطلاع پہنچا دی تھی۔“

”خدا! ساقی میٹرک میں بیٹ ٹرک مار چکی ہے۔ اس مرتبہ بھی سابقہ ریکارڈ قائم رکھا ہے۔ خیر نہ صرف تین مضمون کا بیشتر کر چکی ہیں۔ باقی سب میں مکمل ایذا لگتا ہے۔ پرچوں میں نہاری“ جیلمیں ”اور گلاب جاسن کی شریک گھر کر آئی تھی۔“

فون تو بند ہو چکا تھا اور ممداد سے سے میری دھڑائی کرنے کے بعد صوفے پر بیٹھ پڑ رہی تھیں۔ تم دھڑے سے ان کا سرخ و سفید چہرہ ممتا رہا تھا۔ سبز آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔ یونورٹھی کی پوزیشن ہولڈر میری پیادری ماما کا مدمے کے مارے برا حال تھا۔

”بے شرم! چلو بھرنی میں لوب مودہ انٹن سل کی ہو چکی ہو۔ ابھی تک میٹرک میں انگی ہو۔“

تمہارے ساتھ کی گریجویشن اور سٹوڈنٹ کر کے دو دوپے بھی کھلا رہی ہیں۔“

”آپ کی سستی کی وجہ سے لیٹ ہو رہی ہوں۔ ورنہ اس وقت آپ بھی قانون چلی ہو تیں۔“ میں نے افسوس کے عالم میں ماما کو گزرتے وقت کا احساس دلانا چاہا تھا۔ ماما بھلا کر دوسرا ہونا اندر نے لگیں۔

”سوری ماما! میں فوراً“ صوفے کی اوٹ میں کھنکھناتا کر کھڑی ہو چکی تھی۔ ماما میری بے حیائی کے اس عظیم مظاہرے کو ناگوار کرنے کے بعد مجھے کس سوچ میں گم ہو چکی تھیں۔

میری نظریں ماما کے خالی پیروں پر تھیں۔ سو میں اطمینان سے صوفے پر ڈھمے لگی۔ ماہ حالات میں وہ

جوتے کے ساتھ پیشانی لگا کر سٹوڈنٹ کے خلاف سمجھتی تھیں۔ عام حالات میں تو محض مجھے گھوریوں سے ہی ڈراؤنا چاہا تھا۔ اور ماما کی گھوریوں کا اثر ہی اس قدر ہوتا تھا کہ میں فوراً ”سی جی“ اس بات ہو جاتی۔ اگرچہ ماما کو یہ پسند نہیں تھا کہ وہ میری جوتے کے ساتھ دھڑائی کریں مگر خیر سے ”ممداد!“ یہی کچھ ایسا تھا کہ وہ بھی کہیں تک ضبط کر تیں۔

میٹرک میں مجھے تیسرا سال لگ چکا تھا۔ میری کلاس فیلو ز اور کزنز تو مجھ سے کسی آگے نکل چکی تھیں مگر میں اپنے کندہ ذہن کو بھلا کہیں سے پالش کرانی اور پھر سائنس دانوں کی ”پکواس“ میرے دماغ میں ساقی ہی نہیں تھی۔ مجھے کتنے ہی ٹیوٹر میری ہلاکتی سے گھبرا کر دوسرے ہی دن بھاگ گئے تھے۔ مجھ جیسی کندہ ذہن، بلا لکھ کو ٹیوٹر مقرر کے ساتھ بھلا دماغ کھانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ”تھے طبیعات کے تعارف کی الف ب بھی نہیں آتی تھی۔“

باقی مضامین میں بھی میری دہچکی ایویں سی تھی۔ ریاضی کو دیکھ کر تو مجھ پر ڈر لہ طاری ہو جاتا تھا۔ ابھی پچھلے دنوں میں کوئی چار پانچ ماہ پہلے فزکس کی تیاری کروا تے ہوئے ”میری جان“ سے پیادری غائب نے اچانک میری ذہانت کو جانچنے اور جو کچھ پڑھایا تھا اس کا ٹیسٹ لینے کی غرض سے یو پھلا۔

”ساقی! دس منٹ کے اندر اندر جواب دینی چاہتا“ آج نہیں پڑھا کر میں نے اسو کی طرف جانا ہے۔ میرے لیے کھانا اور چیخوف کی کتابیں لے کر آیا ہے۔ اور میں یہ کتابیں پڑھنے کے لیے سخت بے چین ہو رہی ہوں۔“

خالی کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ ان فضول کتابوں کے نام لے کر گھومنا پوری پکوری اور خطائی کاوا نقد اس کے منہ میں گھل گیا تھا۔ میرے منہ کے زائے اسو کا نام سن کر ہی ”بھٹے“ بگڑنے لگے تھے۔ منہ میں گویا کڑے بادام آگئے۔ ممداد! یہ چاکلھی بیو جیسا کزن فریڈ کے درمیان گردن اکڑانے اور دوستوں کے درمیان دلچسپ رہانے کا سبب تھا۔

”چھوڑو بھی خالی! جس راستہ کا نام ہی اتنا خوف زدہ کر دینے والا ہو۔ اس کی تعریف کتنی کیوں ہوگی۔ بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا چیخوف۔ یعنی تراخوف ہی خوف۔ اور یہ فرانز کا کھانا ایسے لگتا ہے۔ چیسے برا زور کاٹنے میں فورک کاڑ کر کیا جا رہا ہے۔ ہائے خالی! مجھے تو بھوک بھی لگ گئی ہے۔“ میں نے بیٹ پکڑ کر کھائی دی تو خالی نے ہاتھ میں پکڑی کتاب میرے سر پر دے ماری۔

”بھوسا بھرا ہوا ہے ریل۔“ کتاب کے وزن سے میرے دماغ کی چولیس مل کر رہ گئی تھیں۔ اوپر سے چنچے کا سوڈا پکڑا تھا۔

”تمہیں ٹھیک ہی یاد ہیں“ دھون اور وزن کا خطاب دیا گیا ہے۔ تمہارا دماغ پڑھنے کی طرف نہیں مائل ہونے والا۔ پکائے اور کھانے کے علاوہ کچھ نہیں سوچتا۔ کھا کھا کر ایک دن ٹیوٹر کے طرح پھٹ جاؤ گی۔ سوئی! خالی میری اچھی صحت پر چوٹ کرنے سے باز نہیں آتی تھی اور کھانا پکانے کے لئے دیتا تو ماما اور ان کی پیادری بھائی خالی کلورینہ مشغلہ تھا۔ میں نے تو اکثر ہی ماٹوں کو آجیں بھرتے دیکھا ہے کہ ان کی پیادری بچن کے نام سے ہی دھڑکتی ہیں۔ جیسے پودے کا بھی کوئی شوق نہیں ہوگا۔ گھر کے کام کاج سے

الریک ہوئی ہیں جبکہ مجھ میں شغور خواہشیں والے سارے چراغ بجائے جاتے تھے۔ مگر میرے ہاتھ میں بھلاؤد کچھ کر مانتا تھا۔ خالی تھیں۔

”بھئی اسی شوق اور جذبے سے کتاب بھی پکڑ لیا کرو۔“ یہ طعنے تو ماما کی لوگ زہار پر ہر وقت چھٹا رہتا تھا۔ مجھے ماما کی کسی بات نہیں۔ یعنی میں جو ایک شرا میڈ کی خدمات سر انجام دیتی تھی۔ ان کی ماما کے نزدیک اس کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

”ساجد مراد! میں آپ سے پوچھ رہی ہوں۔ علم موسیقی اور آواز پر سائنسی دریافتیں کرنے والے سائنس دان کا کام بتاؤ کہ تیسری صدی جہری میں بصری میں یہ ہوا تھا۔“ مجھے سوچوں میں اچھا کچھ کر خالی نے کال ٹاراضی کے عالم میں اپنا سوال دہرایا۔

”تیسری صدی جہری میں کون پیدا ہوا تھا؟“ میں نے یادداشت کے سارے خالے گھٹکا لئے شروع کر دیے تھے۔

”کون سی ایسی کھانے والی چیز کے نام سے ملتا جلتا نام تھا۔ علم موسیقی کو دریافت کرنے والے سائنس دان کلم“ میں زہر لب بڑھاتے ہوئے سخت نیشن میں مبتلا ہو چکی تھی۔

”ساقی! خالی کے ضبط کا پتا نہ لہرز ہو گیا تھا اور میرے منہ سے اچانک نقد پڑا ہوا۔ ”شکر قدی“ یعنی اگلے ہی۔“

”بھلاؤ میں جاؤ تم۔۔۔ ایک سوال کے جواب میں چند منٹ رہ کر دیے ہیں۔ پھر میں مجھے تم کا کرو گی۔“ خالی درست جواب سن کر مجھ پر منہ بھلائے بیٹھیں رہیں۔

”سوری خالی!“ میں نے بھی غلطی تسلیم کر کے معافی مانگنے میں دیر نہیں کی تھی۔

”آخری جواب بتاؤ“ پھر جان چھوٹ جائے گی تمہاری۔ ویسے بھی ”گھر“ لگنے والا ہے۔ ”خالی میری دلی کیفیات سے واقف تھی۔ تب ہی تو میرے فیورٹ ڈرامے کاڑ کر کیا تھا۔

”میرے جیسے شغل بے نیازی سے جواب دیا۔  
 ”حالت سکون سے چلنے والی کار کی ابتدائی ولاشی  
 کتنی ہوتی ہے؟“  
 ”یہ ولاشی مفروضاتی ہے۔“ میں نے بھی نظر پکار  
 کتاب میں سے ایک کروٹ نکھا اور بحث سے جواب  
 بھی دے دیا تھا۔ خالی کون سا میری طرف متوجہ تھی۔  
 اپنا چنڈ بیگ کھولے بل کا بیگ نکال رہی تھی۔ سو  
 میرا بھی کام چل گیا اور آج ان ہی چھوٹی مٹی  
 ”چوروں“ کا خیمہ قلم ہونے کی صورت میں بھگت  
 رہی تھی۔  
 ”ممانے کافی سوچ بچار کرنے کے بعد سرفراخا کو میری  
 طرف سے کھانا اور پھر بوتلیں۔“  
 ”سارے! انہیں سمیٹ کر بیچے آجوتے۔ میں تمہاری  
 بیگنگ کرنے لگی ہوں۔“  
 ”تھر کیوں ممانے؟“ میں حیران پریشان ہی تو رہ گئی تھی۔  
 ”تم نیلے کے پاس جا رہی ہو۔“ انہوں نے فیصلہ  
 کن انداز میں کہا۔  
 ”پھر پھو کے پاس تھر کیوں؟“ اپنی نظر چپ پھو پھو  
 کے پاس جانے کے متعلق سوچ کر ہی میں گرا تھی  
 تھی۔  
 ”میں نے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں  
 بھگتے۔“  
 ”ممانے! میں مشغولی رہ گئی تھی۔“  
 \* \* \*
 ”ڈیڈی! ممانے! اسلام آباد بھجوانے لگی ہیں۔“  
 ڈانٹنگ صوم میں کھینچتی ہی میں نے دہائی دیا شروع کر دی  
 تھی۔ تکی اکی یعنی ہڈی ممانے اور ڈیڈی (نیا ابو) آدھا  
 ٹھنڈا پستے کی گھر آئے تھے۔ دونوں غلامی کے بیٹے  
 کو دیکھنے کراچی گئے ہوئے تھے۔ غلام بھائی ڈیڈی کے  
 اکلوتے بیٹے تھے اور میں اپنے نیا ابو ممانے کی اکلوتی بیٹی۔  
 بس کی جارا اختر سنا خاندان تھا۔  
 غلام بھائی مجھ سے چند سال بڑے تھے۔ ان کی  
 شادی کو نو سال ہونے والے تھے اور ان کے ہاں

میرے بیٹے کی ولادت ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے وہ بلا  
 بعد بڑی ممانے اور ان کی والدہ آج ہی ہوئی تھی۔ اور  
 میرے محل ہو جانے والے کمراتے کے متعلق بھی  
 انہیں بتا چکا تھا۔  
 ”سناؤ! ہماری بیٹی کو اتنی دور مت بھجواؤ۔ بھلا اس  
 چنگنی ممانے کے بغیر ہم دیا نہیں گے۔“ ڈیڈی فوراً جذباتی  
 ہو گئے تھے۔  
 ”بھائی جان! اس علاقے کو غیلہ ہی سہارا سکتی  
 ہے۔ شاید میٹرک میں پاس ہو ہی جائے۔“ ممانے بھی  
 جذباتی ہو گئی تھیں اور مجھے بھی گروا تھا۔  
 ”مجھے آؤس پڑھنا تو ہے۔ دن و کھانا نہ پڑے۔“  
 ”زبان بہت چلتی ہے تمہاری۔“ دماغ کو بھی سمجھی  
 زحمت دے لیا کرو۔“ ممانے کو میرا بیچ میں پرانا قلعہ  
 نہیں بھلایا تھا۔  
 ”سناؤ! سامی ٹیک کہہ رہی ہے۔ بچے کا شوق اور  
 دلچسپی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“ بیوہ کی طرح پپا اور  
 ڈیڈی میری حمایت میں بولے تھے۔  
 ”تپ کی ان ہی باتوں نے اس کا دماغ خراب کر  
 رکھا ہے۔“ ممانے کا موٹا آف ہو چکا تھا۔ میں نے بیٹی  
 برائی اور تھکے ہوئی سے خوب انصاف کیا اور دجا چہ کر  
 اپنے کمرے میں چلی آئی۔  
 صبح ہر صورت مجھے اسلام آباد جانا تھا اور آج کی  
 رات میں ہی بھر کر سونا چاہتی تھی۔ بد قسمتی سے میں  
 ممانے اور پپا کی اکلوتی اولاد تھی۔ اگر ان کے اور بھی تین  
 چار بچے ہوتے تو شاید ممانے کی توجہ بیٹ جاتی۔ ممانے  
 خاندان میں بچوں کا فقدان تھا بلکہ قلم کھانا مناسب  
 ہو گا۔  
 اللہ بخشے داوی مرحوم جب زندہ تھیں تو ممانے اور  
 بڑی ممانے کی ہر وقت شامت آتی رہتی تھی۔ انہیں اس  
 بات کا بہت فتن تھا کہ ان کی اولاد کی بہت کم اولاد ہے۔  
 بڑی ممانے کے بیٹے کی ماں تھیں۔ اسی لیے ان کی بچی  
 بچت ہو جاتی تھی۔ البتہ میری ممانے تو داوی کا اکثر بیٹا  
 مذاب نازل ہو کر رہتا تھا۔

”ممانے! اس “مشیقی“ کو پیدا کر کے گویا کے ٹوکا  
 پھاڑ کر لیا ہے۔“ داوی بھی میری اچھی صحبت سے  
 خاصا متعلق تھی۔ یہی حال غیلہ پھو پھو کا تھا۔  
 ”دماغ کو زحمت ہو نہیں دیتا۔ اسی لیے گوشت  
 کا پھاڑ بنی جا رہی ہے۔“  
 انہوں نے میرے بھرے بھرے سڈول سرائے کو  
 گوشت کے پھاڑ سے تشبیہ دے کر میرے بازو  
 جذبات کو بری طرح سے بھونچ کر دیا تھا۔ اپنی تو صرف  
 دو ہی تھیں کی تاؤ کی طرح لمبی سوکھی پائیں تھیں وہ  
 بیٹیاں تھیں اور ڈگریاں میرے دھبے کی بھی اٹھنی کر  
 رہی تھیں۔ اس طرح کے دردوں کی میں بچپن سے  
 ہی معلوم تھی۔ میری صحبت اور تعلیم یہ وہ ایسے مسئلے  
 تھے جو میرے خاندان والوں کے لیے مسئلہ قلعہ بن  
 چکے تھے۔ نہ تو میں ممانے اور پھو پھو کی خواہش کے  
 مطابق اپنی صحبت و دانشک کے شوق میں چہ کر سکتی  
 تھی اور نہ ہی میٹرک میں مجھ سے پاس ہوا جا رہا تھا۔ یہ  
 دونوں کام یوں لگتا تھا جیسے میرے اعتبار سے باہر تھے۔  
 ”کھانا پنا پھو ڈر میں کیسے بی بی کی مرید بن سکتی  
 تھی؟“  
 ”سوکھی مڑی ہڈیوں کی وصافچی سی ساجہ مراد بھلا  
 کیسی گلتی؟“ یہ سوچتی ہی مجھ پر کچھ طاری کر رہی تھی۔  
 سو میں ڈٹ کر تینوں وقت کا کھانا کھاتی تھی۔ ممانے  
 کھویروں کی رواہ کے بغیر۔ اور بارہائی کا مسئلہ۔ تو  
 شاید کسی نہ کسی طرح میرا میٹرک میں اسے پاس آجاتا  
 اگر ممانے آؤس پڑھنے دیتیں۔ شاید اس وقت میں  
 اردو ادب یا فائن آرٹ میں اپنا نام بنا چکی ہوتی۔ مگر  
 بڑے میری قسمت مجھے تو ابھی تک بہنی کرنت اور  
 متعلقہ سب کے درمیان غلطی کو معلوم کرنے والے  
 کا نہیں پتا تھا کہ وہ دلہنتک ہے نیوٹن ہے فیزاؤلے  
 ہے یا پھر اور ملے ہے۔  
 اپنی تاؤ تین بے عزتی پر میں جی بھر کے تھلا  
 رہی تھی۔ اس تھلاہٹ نے تو زندگی بھر میرے ساتھ  
 ہی رہا تھا اور اب جو غیلہ پھو پھو کے پاس بیچ کر مجھ

بے چاری پر قلم کے پھاڑ توڑے جا رہے تھے مگر بھلا  
 ہو میرے بارے ڈیڈی کا۔ انہوں نے صبح صبح کھانے  
 کی میز پر ایک جذباتی تقریر کر کے ممانے کے ارادوں کو  
 ڈالوں ڈال کر دیا تھا۔ تب ہی تو ممانے شہو کو میری  
 بیگنگ کھولنے کا آواز دے کر کھینچے حد سے زیادہ مسرور  
 اور شلو کر دیا تھا۔  
 ڈیڈی کی بے پایاں محبت پر پہلے بھی مجھے شک  
 نہیں تھا مگر اب تو اس محبت پر گویا مرگ چکی تھی اور  
 اوپر ڈیڈی میرے کپڑوں میں کہہ رہے تھے۔  
 ”ممانے! تو ان خواتین کے ہاتھ سے بے پروا کھانے  
 کھا کر ہم نے بھلا مرنا تھا کیا؟“ مجھے اپنی بیٹی کے ہاتھ سے  
 اپنی کاپی ہے۔ بغیر غلام بھائی کی تھی؟“  
 ”ممانے! یہ فرس اور کیمشری۔“ میں دوا دیتے کو  
 تھی۔  
 ”ارے“ چہلے میں جھوٹو فرس کو۔ کوئی  
 ضرورت نہیں! تھکی سی جان کو تم لگانے کی۔ اگلے  
 سال آرام سے بیچ دے لو گے۔“  
 پاپا نے لاہور والی سے میرے شانے تھمتے تھے۔  
 ایسے ہی تو میں اپنے پاپا اور ڈیڈی کے گیت تھمتے کاتی  
 تھی۔ انہوں نے بھی مجھے پاپس ہونے نہیں دیا تھا۔  
 ان کی انکی ہی محبت کی وجہ سے میں ابھی تک میٹرک  
 میں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ اصل رزلٹ آنے کے بعد ممانے  
 مار کٹائی کا بیڑہ لگتی تھیں۔ اور پھر میں تین چار کھینچنے  
 سوگ کی کیفیت میں گزارتی تھی پھر میری سوچی سوچی  
 آنکھیں دیکھ کر ڈیڈی اور پپا کی جان سے میری بہت  
 بندھ جاتے تھے۔ ان سے میری ایشوریہ رائے بھی  
 معلوم ہوتی تھیں انہوں میں آتسوہو کس دیکھے جاتے تھے۔  
 ”سامی! انیشن نہیں لیا ہے؟“ اگر تے ہیں شہوار  
 ہی میدان جنگ میں“ تم ایک دھند پھر کو بخش کرو۔“  
 ”تھمت کرو۔“ یہ ڈیڈی کے الفاظ ہوا کرتے تھے اور ممانے  
 تھمتا ہوا تھا۔  
 ”بھائی جان! آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں! میں  
 ٹینڈر لی سک رہی جاتی ہے۔“



”اگر یہ منشن کئی تو اس کا طول اور عرض اتنا پھیلا ہوا نہ ہوگا۔“ اسو بھائی بھی میری ”صحوت“ کے دشمنوں میں سے تھے۔

”مومنہ“ خود بڑے اسٹارٹ ہیں۔ ”میں نے پاک چڑھائی۔“

”بک بک سن لو بس۔“ ”میرا غصے سے بولیں۔“ ”چو“ اسو کے لیے جانے بھلاؤ۔“

”کلام کے وقت ساجد پاؤں جاتی ہے۔“ میں کہنے سے باز نہیں آئی۔ ”فزی سے کہیں نکالے بھلائے۔“ میں نے شان بے نیازی سے کہا۔

”مجھے تو شائد نہیں پتا۔“ اسو بھائی نے ناگواری سے کہا۔ ”ساتی کے علاوہ کوئی اچھی جانے والی نہیں سکتا۔“ اب وہ میری تعریف کر رہے تھے۔ جسے میں سراسر خوشدل سمجھ رہی تھی۔

”مسکے مت کہیں۔“

”یہ مسکے کیا ہو تا ہے؟“ وہ حیران ہوئے۔ ”اک بات تو جہ ہے۔ میری سن سے اچھی کوئی چالے جانی نہیں سکتا۔“

”بہن۔“ ”صدمے کی شدت سے میرا دل ڈوبنے لگا۔ نہ جانے یہ خوبصورت اور قاتل لڑکے کو میں سن ہی کیوں نکلتی تھی۔“

اگر شادی ہو جاتی تو کم از کم پڑھنا تو نہ پڑتا اور میں واحد ایسی لڑکی تھی جو اپنے لیے بھرے بے کھالے بننے کے شوقین سسرال کی دعائیں مانگتی تھی۔ جنہیں کھانے کھانا میں اپنا کر دینا جاتی اور کم از کم وہ مجھ سے میری ڈگریوں کے بارے میں نہ پوچھتے۔

مما کے نزدیک میں ساری دنیا کی لڑکیوں سے زیادہ بلا کم و کمال اور کنفید بہن تھی۔ کمرہ لای دل میں وہ میرے ٹھکانے کے قائل ضرور تھیں۔ میں ہر فن میں مطلق تھی اور میرے ٹھکانے کا سارا آرٹیفٹ بڑی مہما کو جانتا تھا۔ انہوں نے مجھے کو گنگ سے لے کر سلاخی کر زحالی تک ہر فن میں مطلق کر دیا تھا مگر مما کے نزدیک میری ان خوبیوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ

”دو لیے لوگوں کے سیاہے“ کہہ کر میری ان خوبیوں کو مٹی میں بدل دیتی تھیں۔

”ساتی ایک تو تم جانے کس مراقبے میں چلی جاتی ہو۔“ ”سمرانے نکلی سے لے کر اب اندھ بھی چکے۔“

”جاری ہوں۔“ ”میں دھپ دھپ کرتی کچن میں چلی گئی۔“

\* \* \*

میں بڑے شوق اور جذبے کے ساتھ فٹ کری ہمارے تھی۔ پھلی کو تین لگا کر پہلے سے رکھ دیا تھا۔ پیاز بھی کوٹھن کر لی تھی۔ فٹ بھی فرائی ہو چکی تھی۔ بس تو مجھے کچھ کھانا تھا۔ ساتھ ساتھ اٹلین سلاو کی تیاری بھی کر رہی تھی۔ یہ مینو ڈیٹی کی پسند کے مطابق مٹی میں نے ترتیب دیا تھا۔ کوٹھن پر پانی دم پر تھی۔ اسی ٹیل فون کی گھنٹی بجی تھی۔ میں دو ٹوٹا ”فون“ سلیپ پر رکھے لوٹ کر بھی لگا ہوا دل رہی تھی۔

”گنگ“ اب فون سننے لگاؤں میں جاؤں۔ ”میں نے ہمارا کر سوجا۔ فون بے چارہ بچ کر خاموش ہو گیا تھا۔ تب ہی ماما اور بھئی مہمان تک دوں سے پرے ہو گئیں۔

”نجانے کون سی میٹنگ کر کے فارغ ہوئی تھیں۔“

”دکس کا فون تھا ساتی۔“

”ابن ابیہم کا ہو گا۔“ میں نے رونا لگاتے ہوئے سلاو کے لیے غصہ کا شعلہ شعلہ کر دیا۔

”چپ۔“ وہ کون ہے؟“ بڑی مہم سے وہ حیران ہو گئیں۔ فون کی گھنٹی پھر سے بجنے لگی تھی۔ بھئی ماما ابن ابیہم کے متعلق تفصیل پوچھنے کا ارادہ کر کے فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئیں۔ کچھ دیر بعد مجھے بڑی مہمائی افسردہ سی آواز سنائی دی۔

”کچھ دن بعد آئیں گے کسی گھریلو پر اہم کی وہ سے ان کا پروگرام ملتوی ہو گیا ہے۔“

”اس کے نصیب ہی نصیب ہے۔“ ”مما کی فکر اور شدید پریشانی میں ڈوبی آواز سنائی دی تو میں نے چونک کر ان دونوں خواتین کے ہنجر چہروں کی طرف دیکھا۔“

کس کے نصیب نصیب ہیں۔ یہ پوچھنے کی ضرورت تو نہیں تھی۔ ماما کا اشارہ یقیناً میری ذات گرامی کی طرف تھا۔ شاید کچھ مہمانوں کو اتنا تھا اور اب ان کا پروگرام بدل گیا تھا۔ یقیناً ”انہیں بھی میرے مونہ پر کی ہوگ چکی ہوگی۔ ایسا ایک دو مرتبہ پہلے بھی ہو چکا تھا۔“

میری ذات کے ساتھ بے شمار مسائل کا انبار بھی بڑا ہوا تھا۔ ایک تو میری ملا تھی ”وہ سراسر میرا پھیلا ہوا وجود۔“ میری یہ گزیر بھی زبان بولنے سے مہمانوں کو دیکھ کر منہ کے اندر روکتی ہی نہیں تھی۔ کبکنت تیز گام کی طرح چلتی جاتی تھی۔

”پچھلے دنوں کچھ خواتین آئی تھیں۔ میرے گورے بچے خوب بھرے بھرے سر پہ کو کھانے والی نظروں سے دیکھتی رہیں۔ بعد میں کلا بیسٹا“ انہیں آئے کی پوری نہیں چاہیے۔ بس مجھے بھی غصہ آ گیا۔ بڑی مہمائی پر سٹل انڈری میں سے ان خواتین کا فون نمبر چا کر اکر دے لے کر یاد دہی کرتی رہیں کی تمام عمر اس شائد اہل عربی کو۔ ساجد ماما کو آئے کی پوری کہنے کا قیام نہ بھگتا تو تھا ہی۔ میں نے بھی ان کے گچھے بیٹے کی شان میں ایسے ایسے القابات کے کہے کہ بے چاری تمام عمر مٹی تختی رہیں گی۔“

یہ وہ سری نخوس ترین ٹیلی فون کل تھی۔ وہ میری زندگی میں بدبو پھیلانے کا باعث بنی۔

مما کی پریشانی نے مجھے بھی کچھ پریشانی کر دیا تھا مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ ماما کو ان دنوں مجھے پڑھائی کی افادیت پر لے گئے۔ پچھلے دنوں کچھ خیل نہیں رہا تھا۔ وہ سراسر حیرت کا ہونکا مجھے تب تک جب تو اس کی کتابیں میری دانشک نہیں مریج گئیں۔ ماما نے اپنی ضد چھوڑ دی تھی۔ ان دنوں کے سرے سے مجھے دھیر سارا پڑھانے کا صبر نہ تھا۔ اب وہ مجھے سلم ایڈ اسٹارٹ دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے سلسلہ سیر کی میڈم سے بات بھی کر لی تھی۔

”وہ میرے کچن میں کھنے پر شدید دبانڈی لگ چکی

تھی۔ میں اپنے پسندیدہ بھیکٹ رکھ کر اس قدر خوش نہیں ہوتی تھی جس قدر کچن میں کھنے پر دبانڈی لگے تھے۔ وہ ماما کا تھا۔ ماما مجھے کچھ کچھ کچھ کا پڑھائی پڑا کر دے کی ایک پھولی سی پائی کڑا دیتی تھیں۔ میں دن اس پائیلی اور حکم کے بعد میں نے اپنے زور خیز دل سے کچھ نئی ترکیبیں نکال لی تھیں۔ کچھ ڈیٹی اور کچھ پائی سے دو تین سو روپے لیا میرا معمول بن گیا تھا۔ کیونکہ ماما اور بھئی ماما مجھے دلا کر دے لے کر وہ عود کر کھا تھا۔ اس عود کو د نظر رکھ کر میری کٹ مٹی بھی بند ہو چکی تھی۔

اب ماما مجھے پڑھائی پر نہیں بلکہ ڈانٹنے پر بڑے بڑے اور بے لگہو تھی۔

ان دنوں ماما کی سب سے بڑی منیشن میرا پڑھنا ہوا وزن تھا۔

جس دن میرا میٹرک کا شائد ارڈر لٹ آیا یہ اسی دن کی بات ہے۔ یہ دن میرے لیے خوشگوار نہیں تھا۔ ماما کچھ ماما اور بھئی ماما میرے پھولے پھولے گلابی چہرے پر نہ جانے کتنے ہی روئے دے چکی تھیں۔ ماما میرے اچھے رزلٹ پر پھولے نہیں ساری تھیں۔ اور ڈیٹی فخریہ کہہ رہے تھے۔

”میں نہ کتنا سارا دلسا کی کو آؤں پڑھنے دو بچے کی دلچسپی اور شوق کو اولیت نہ دینا چاہیے۔“ ”مما آج ڈیٹی سے متعلق ہو چکی تھیں۔ انہوں نے کسی بھی قسم کی بحث نہیں کی تھی۔“

رزلٹ کو خاندانے ماما کو فون کر کے بتایا۔

”آپا! بڑی آپا نے اسو کے لیے غصے کو مانگا ہے۔“ اس خبر نے ماما کے چہرے کے سارے رنگ اڑا دیے تھے۔ شاید وہ بھی اسو بھائی کو بطور داماد پسند کر چکی تھیں۔ تمام بھائی کی خوشی پر انہوں نے کم علی کا مٹا ہوا نہیں کیا تھا۔ پہلے پھولی خالہ کو اور پھر بڑی خالہ کو مبارکباد دی۔

”وہ میرے اداؤں پر بھی اوس پڑ چکی تھی۔ بتائی اور اسو بھائی سے اچھے اچھے گفتگوں وصول کر کے

میں نے بھی اوپر ی دل سے انہیں مبارکباد دی۔ اگر اسوں بھائی کے ساتھ بات بن جاتی تو میں نے ایف اے کے بجائے شادی کرنا تھی۔ مگر بے میرے نصیب۔ جو بھول ماما کے بالکل برف یا آئس کریم کی طرح ٹھنڈے تھے۔

خاندان کے سارے ہی لڑکے ایک ایک کر کے کھوئے تھے۔ بڑھ چکے تھے۔ حنا اور صبا جیسی عالاقل لڑکیاں بھی ۵۰-۶۰ سال کی امائیں بن چکی تھیں۔ میرا دل جل جل کر خاک ہو رہا تھا۔ اور اصر اسوں بھائی اور عاتق کی شادی کے بنگلے جاگ اٹھے۔

مما بھی ہنسی خوشی بھی چیز تو کسی بڑی کی شایگہ کو لے چلی جاتی تھیں۔ لیکن ان دنوں میرے صحت مند کندھوں پر تھا۔ سوئی میں ہی بھر کر پٹ پٹے کھانوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

ڈیڑی اور پلایا بھی خوب مزے کر رہے تھے۔ ان دنوں وہ دنوں کو پرکیز بھول چکا تھا۔ میں بھی ٹراماٹک اسٹ کو دیکھتے ہوئے سینور تھپ تھپاتی تھی۔

بڑی ماما تو عرصہ ہوا کہ کوئی یاد نہ رہی تھیں۔ سہالی بلڈ پریشر کے مرض نے انہیں خالصا مایہ کر دیا تھا۔ اور

مما کو بھی میں اب کم کم ہی مکین کی طرف جانے دیتی تھی مگر صوب سے ماما کو میرے پھیلنے دھوکہ دیکھ کر شاک کا تھا اور میرا لب تک رشتہ نہ ہونے کی یہ بہت بڑی "وجہ" معلوم ہوتی تھی تب سے لیکن میں میرے واسطے پر پابندی لگا دی تھی مگر خیر اب تو آنسوئی ہی آنسوئی تھی اور میں اس آنسوئی سے خوب فائدہ اٹھا رہی تھی۔

شادی کے بنگلے جوں ہی سرور سے ماما نے میرا دوبارہ وطن کروایا اور پھر کچھ مدت پوچھے میں اپنا چندہ کلو وزن بڑھا چکی تھی۔ ماما نے مجھے میرے محل پر چھوڑ دیا۔

میں نے انٹر میں ایڈمیشن کیا یا مصروف سے مصروف تر ہوتی چلی گئی۔ پڑھائی اور کھانے کے علاوہ مجھے کچھ سوچنا ہی نہیں تھا۔ جی ماما کے میں داخل ہوئیں۔

"سارا بھائی کی روتی کار شہ بھی ملے ہو گیا۔" یہ خبر خاصی روح فرسا تھی۔

"بھائی! سارا سارے کے سارے بول ہی نہ سکیں۔" اچھی خاصی مونی اور ساڈلی سی بھی مگر پوزیشن ہولڈر تھی مگر کچھ زیادہ ہو گئی تھی اسی لیے بے چاری پتھر پر پڑی تھی۔ "ماما نے میری طرف دیکھ کر ٹھنڈی آؤ بھری۔

"پلو بھائی پریشانی تو دور ہوئی۔ اللہ سب کی باتوں کے نصیب ایسے کرے۔" بڑی ماما نے صدق دل سے دعا کی۔ نظریں ہنوز مجھ پر تھیں۔ گویا خصوصاً میرے لیے بھی دعا کی تھی۔

"روتی بانی کی شادی میں کون جائے گا۔" مجھے اپنے کہنوں کی فکر ہو گئی تھی سو بے کلی سے پوچھنے لگی۔

"تم تو ہرگز نہیں جاؤ گی۔" ماما کا انداز فیصلہ کن تھا۔

"کیوں؟ اب تو میں میٹرک بھی کر چکی ہوں۔" میں نے دہلی صورت بنا کر کہا۔

"بڑا تھیرا دیا ہے تین سال میں میٹرک کر کے۔" ماما سوسوں کی طرح طنز و تہا میں مابہر تھیں۔

"کر لو کیا ہے۔ اگر اس دفعہ بھی ٹھل ہو جاتی تو اچھا تھا۔" میں ہنس کر بولی۔

"بے وقوف! حق تو یہ تھا کہ میں۔ اگلے گھر جا کر نہایت کون کون سے" گل "کھلائے گی۔"

"مجھے گل کو مٹا لگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کو اچھی طرح سے خبر ہے میں "گل" سے کس قدر چڑتی ہوں۔" گل ہماری بیویوں بھی پیا کے دوست کی بنی۔ ان دنوں خطیاں گزارنے کی نینڈا لگی ہوئی تھی۔



میں اس وقت ٹیڑس پر بیٹھ کر کیوں کے ساتھ معمولی سا انصاف کر رہی تھی۔ صرف چھ کپے ہی کھائے تھے۔ جب میری بیویوں کے ٹیڑس کی ریٹنگ

جیسے ایک ساہ چلتی آنکھوں والے خوب لڑکے نے مجھے ساتوں کھلا اٹھاتے دیکھ کر گویا منتی کھل کر دی تھی۔

"اب مزید ایک بھی کیلا مت کھانا۔ ورنہ تمہارا اندہ سنی میرا اپنا معدہ تمہیں کیلے کھاتے ہوئے دیکھ کر چھٹ جائے گا۔ مانی گا! بیٹ سے کہ کنواں! ابھی وہ سرخ سرخ صیاب بھی پلیٹ میں ڈھک کر رکھے ہوئے ہیں۔ یہ کسی اور کے معدے میں ڈالو گی؟" مسلسل بولتا ہوا بڑی بے تکلفی کے ساتھ ہمارے ٹیڑس پر کود گیا۔ یہ کیلے صیاب تو مجھے ہضم ہو سکتے تھے مگر ان خیرم کی بے تکلفی ہرگز نہیں۔

"کون ہو تم؟" میں نے اسے اندازہ چاہی موز میں دھانے کی کوشش کی تھی مگر گتے میں کافی تکلیف دہ خراشیں پڑ گئیں۔

"میں داؤل کالیف ہوں۔" مقابل نے خالصا مجموع کر بتایا۔

"میں کہہ رہی ہوں! اپنا نام بتاؤ؟" مجھے ایک دفعہ پھر حلاجی بنانا پڑا۔

"بتایا تو ہے۔ کیف ہوں 'سرور ہوں' 'نشہ ہوں' 'خدا ہوں۔' مستی ہوں۔" وہ پھر سے طار بھرے انداز میں بولا۔

"یہ سارے نام تمہارے ہیں؟ حق! مجھے صرف ایک نام بتاؤ۔" میں نے ہماز کر کہا۔ دراصل میرا ارادہ یہ تھا کہ وہ کچھ پھانک کر ذرا رشاک آتی (گل کی می) سے شکایت لگا کر آتی ہوں کہ گھر میں کس بدتمیز سمٹاں کو کہہ ہوا ہے۔ جو باختر اجازت کے دوسروں کے گھروں میں گھس کر بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ رشاک آتی تمہاری رشتے میں کیا لگتی ہیں۔" میں نے آنکھیں دکھا کر پوچھا۔

"ڈیڑی کی بس۔"

"یعنی تمہاری پھوپھو؟"

"جی سمجھ لیں۔" اب وہ ریٹنگ کے اوپر جھک کر ہمارے کان کا پتھر نہ رہا تھا۔

"یہ پھول پورے کس نے لگائے؟"

"ساجید نے۔" میں نے سوچا کیوں نہ تریف ہی ہو رہی جائے۔

"یہ کون خاتون ہیں؟" وہ چونک کر پوچھنے لگا۔

"میں اور کون۔"

"لو! تو اب کا نام ساجید ہے۔" اس نے آنکھیں سنبھل کر میری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ "اب کا نام تو کوئی بھاری بھر کم جسم کا ہونا چاہیے تھا۔ دروازہ"

سلطت آرایا ہزارہ تیکم۔

"کیا مطلب؟" میں پوچھا تھی۔ "رفع ہو جاؤ یہاں سے۔" کوئی میری صحت پر پوٹ کرے تو میں زخمی شیرینی بن جاتی تھی۔ کچھ میں فخر تھا۔ جگر الو تھی۔

در اصل اس کے پیچھے بھی بے شمار وجوہات ہیں۔ میرے گھر والوں کی بے شمار ذواتیاں اور ظلم اور غم کے مختلف احوال میں مجھ پر ٹوٹے رہے تھے۔ شروع سے ہی مجھے ہر بات پر ڈی کر لیتے رہا۔

میں جو ماما بھائی کے اتنے ساتوں بعد اس ظالم گھرانے میں پیدا ہوئی تو ان لوگوں کو میری قدر کرنا چاہیے تھی۔ ہونا تو چاہیے تھا کہ یہ لوگ شکرانے پرستے تمنازیں بنائے، مگر وہ کچھ یوں۔ ماما جیسی جتنائی بھی کو پیدا کر کے ہمار دنگلی تھیں۔ سارے گھر والے معصوم سی گول کو تھنی پٹی کو بھول بھل کر ماما کے غم میں ادھ مٹے ہوئے لٹکے۔ اس وقت جذبات میں آگریہ تک کہہ دیا تھا۔ "اس سے بہتر تھا"

میں بے اولاد ہی رہتا۔" یہ اس ٹارک گمزی کی جذباتی ی کیفیت تھی۔ بعد میں پلایا نے مجھے اپنی آنکھوں کا ستارہ اور پھٹیل کا پھٹالا بتا چاہا تو میری نظر ماما درمیان میں کود پڑی۔

"مراؤ! کیا ساقی کو بگاڑ دے گی۔ ایک سی ہماری بیٹی ہے۔ اس کی تربیت میں چوک نہیں ہونی چاہیے۔"

ماما نے ۵ سال کی عمر میں تربیت کرنے کے پتھر میں مجھے جو خوشنظر نظموں سے گھورنا شروع کیا تو اب تک یہی سلسلہ چلا آ رہا ہے۔

میں بچپن سے ہی ماما کے ظلم و جبر کا نشانہ بنی رہی ہوں۔ ظاہر ہے! انکوئی تھی۔ سارے ختم مجھ مسکین



بریں ڈھائے گئے۔ علامہ محلی ایک تو مجھ سے بہت بڑے تھے۔ اوپر سے بلا کے فریال ہزار۔ مجھے دیکھ دیکھ کر تو مٹا کو ہول پڑتے تھے۔

”جائے لڑکی ذات اور اسی بد زبان۔ یو حتی ہے تو گویا  
چھت پھاڑنے کے ارلوے سے۔ کبھی علو کو اوچی  
آواز میں بات کرتے دکھا ہے۔“

مما کا خیال تھا قصور میرا بھی نہیں میں اپنی پہچان بھی  
کا مزاج چاہا لائی ہوں۔ سو میری گرم مزاجی سے کھر

والوں نے مجھ کو آکر لیا تھا۔ بس یہی وجہ تھی کہ میں۔  
 "محترمہ! آپ کس علاقے میں چلی گئی ہیں؟" وہ  
 بالکل میرے سامنے آکھڑا ہوا تھا اور میں جو ہاضی کی  
 بھول پھیلوں میں گم تھی، اب انہیں سے اب تک اپنے ساتھ  
 کی جانے والی نزادیتوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔  
 ایک دم چونک کر وہ غوار نظموں سے اسے دیکھنے لگی۔

”تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو؟“ جوں ہی میری نظر اس کے ہاتھوں تک گئی۔ میرا پارا چڑھ گیا۔ وہ کہنے لہجوں کے دس میں گئے ہوئے سیب چٹ کر گیا تھا۔

”کس کی اجازت سے تم نے میرے سیب کھائے؟“

اس نے میز سے ایک نشو بھی اٹھالیا۔

”خود کو اپنے اعمال سے انکار کرنا ہے؟“

معمولیت سے یہ تھا  
"تھیں افکار و سرے میری پر پیمتک دے"

”اس میں اتنی جان ہے؟“ وہ ہمارے چمکدار کی

صحیح برپا کر دیا۔ ”یہ کام تو آپ پر سونپا گیا ہے اور آپ سناوائے سے کچھ بھی سکتی ہیں۔“  
”کون سا کام؟“

”اب کیا تشریح کروں۔ خیر! اللہ آپ کو نظر دے  
جائے۔“ وہ بیک وقت میرے صحت مند سراپے پر  
جس چٹ کر رہا تھا۔ یہاں میرا غصہ کرنا تو بڑا تھا اور  
غصہ ہو چکا۔ میری ناک پر دھرا رہا تھا۔ سو میں فوراً ہی  
بیٹھ رہی۔

”جانتے ہو سہی سے کہ میں مٹا کو بلاؤں؟“  
”اتنا تردد کر کے نیچے جاتا ہے تو میرے لیے چائے

بھی تھی آتا۔ میں بیس روٹ لڑوں گی۔ اس نے بڑی  
دوستانہ مسکراہٹ سجا کر کہا۔

پلیٹ اٹھا کر کھا۔

”تم کس کی اجازت سے ہمارے گھر میں آئے ہو؟“

”اپنے دل کی اجازت ہے۔“ وہ حڑے سے بول اور

”میں سنا یہ مراد! ہم پھر ملیں گے۔ ابھی چلے  
ہوں۔ آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ زندگی بہی تو پھر  
حالات ہو گئی۔“ وہ سرے ہی بلبل رنگت سے کہہ کر  
دو سری طرف چلا گیا تھا۔ جبکہ میں جھٹکتے ہوئے بیٹھے  
اتر گیا۔

میرا ایف اے میں پاس ہو جانا میرے گمراہوں کے لیے بہت اعلیٰ تعلیم کی دولت مل جانے کے برابر تھا۔ غرضی پاپا اور ماما اس خوشی میں کسی بڑی ضیافت کا اہتمام کرنا چاہتے تھے، مگر نبیلہ، پھر بھو کی بیماری کی خبر نے

”ساتھ کھیں نہیں پڑھی، ایڈیٹنگ کیوں نہیں لیا؟ کون کون سے سبیکسٹ پڑھیں گے؟“

اب بھلا چھو چھو کو کون بتائے جس نے مزید پڑھنے کا اعلان کر دیا تھا اور میری پڑائی بھانے اس اعلان کو سن کر فی الحال جواب دہ تھے اسے پڑھیں کیا

تھا۔ دراصل میرے اتر میں پاس ہو جانے کی خوشی میں انہوں نے اپنا موٹر خراب نہیں کرنا چاہا تھا اور

آپلو سد حاروی تھیں۔

کل تمام تر توجہ کامرکزی دی مورد کچن تھا۔

اس دن بھی میں بڑے افق و شوق کے ساتھ ڈیڑی کے لیے چاہن بیٹاری تھی۔ اس کی ترکیب میں نے

”سنا کہ ایک بار افسانہ آئے تھے۔“

میں لالہ مرزا اور نور زہرا کے ہم پیش  
کے کر رہی تھی۔ چاہے کہ سلاخوں میں لگا تھا۔ اس

شہر کی طرف متوجہ ہوئی۔ "کون ہے؟"

ہر ایک کو مطلوب مقام پر پہنچانے کی کوششیں کی گئیں۔

میں اپنا حلیہ دیکھ کر بولی۔  
 ”چائے کے ساتھ کیا اور کچھ؟“  
 ”نیمس، بول، تمہارا اور میں ایک بھی رکھ لیتا،  
 بیٹی کے کوئی دوست ہی ہوں گے۔“ میں نے انازا“  
 جیسے ہوئے ذرا انگ ملام کارم کا رخ کیا تھا، مگر صوفے پر

وہ خود شخصیت کو دیکھ کر میرے منہ میں گویا کہنے لگا

”جی نہیں۔ آپ کیوں شکندہ کہتی ہیں؟ یہی

”وہ انکار کرتا ہے“

ان میں وہ کہیں چلا گیا تھا۔

"مبارک بادو ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔  
 "ہائے" اسے بھی خیر ہو چکی۔ "میرا دل ڈوب کر

”اٹا حیران کیوں ہو رہی ہیں۔ دراصل مجھے رخصت

میں رہا ہوں۔  
 "سوگ؟" میں چونکی۔ "بھلا کیسا سوگ؟ کیا ہوا؟  
 کسی نے کچھ کہہ دیا؟" میری بخش پسند فطرت  
 انگڑائی لے کر جاگ اٹھی تھی اور فوری طور پر میرے  
 ذہن نے ایک کہانی کا تاپنا بھی سن لیا تھا۔ گل کے پیار  
 میں ہاگل لیکن۔ گل کا جری جھنڈی دکھانا اور پھر  
 کیف کا سوگ میں اتنے دن غرق رہنا۔ اور میرے  
 اندر مارے جتنس کے گوگردی ہونے لگی تھی اور میں  
 بس قیامت ساری کہانی کو جاننے کے لیے بے چین ہو  
 گئی تھی اور اس لمحے مجھے بھول گیا تھا کہ میری پہلی  
 ملاقات کافی ناگوار رہی تھی۔  
 "بس جی، کچھ نہ پوچھیں۔ نوکوں کے دورے  
 چرے ہیں۔" دور غیبت کی سی بولا۔  
 "کس کے؟" میں حیران ہو گئی۔  
 "ہماری پھوپھو محترمہ۔" وہ جل بھن کر بولا۔  
 "مگر ان کے دو چرے گل ہیں؟ مجھے تو صرف ایک  
 چوہی دکھائی دیتا ہے۔" میں نے ہوشی پن کی انتہا کر  
 دی تھی۔  
 "میرا کہنے کا یہ مطلب نہیں۔" وہ جھنجھایا۔  
 "یہ جو میری پھوپھو ہیں۔ ایک نمبر کی بد عہد ہیں۔  
 وہ خوب جلا بیٹھا تھا۔  
 "انہوں نے کیا کیا؟"

"پھوپھو نے کہا تھا ان پھوپھوں میں وہ ضرور ہمارے  
 گھر رہنے کے لیے آئیں گی مگر اب وہ مگر گئی ہیں۔"  
 کیف نے سہمہ کر بتایا تھا اور اوپر میرا منہ اتر گیا۔ جو  
 کچھ میں سننا چاہتی تھی اور جس محبت کی کہانی کا مجھے  
 انتظار تھا۔ سب خواب ہوا انکو وہاں اور نکلا کیا؟  
 "تم گل کو ساتھ لے جاؤ۔ وہ بھی بس آئے ہی والی  
 ہے۔" میں نے اس کو قسلی دینے والے انداز میں کہا  
 تھا کہ وہ بول چلا گواہ اسے کرشن لگ گیا ہو۔  
 "تو جہ کریں جی، پھوپھو کو تو اس لیے ساتھ لے کر  
 جاؤں گا چند دن کے لیے ہی سہی، میری بچن سے  
 جان بچوت جائے گا، میں بھی چار دن سکھ کا سانس

لے سکوں گا مجھے پاگل کرنے سے کٹا ہے کہ میں گل کو  
 لے جاؤں گا۔ میری مزید سختی تھا کہ میں وہ مگر  
 کے لیے بھی بچن سے باہر نکل سکوں۔ "کہ تو وہ  
 ٹھیک ہی رہا تھا۔ گل کی بڑھائی اور کام چوری مجھ سے  
 بڑھ کر کون جان سکتا تھا۔ گلابی اور سسکی خصوصاً بچن  
 کے کاموں میں محترمہ گل پر ہی قسم ہوتی تھی۔  
 "بچن کے کاموں سے تو گل کی جان جاتی ہے۔"  
 میں نے غمو کو زلی ٹھیک کر اندر آئے دیکھ کر گھبرا۔  
 اس کے لیے اتنا اہتمام کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔  
 راتوں سے تو کیا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ غمو کا بھلا کیا  
 قصور ہے۔ آرزو تو میں نے خود ہی دیا تھا اور اوپر کیف  
 نے مجھے پکا بکا کر دیا۔ وہ کباب کھاتے ہوئے بول رہا  
 تھا۔

"اسی لیے تو میرا اور فیلی پلٹوں کا مشترکہ فیصلہ ہے  
 کہ گل ہماری بھابی نہیں بن سکتی۔" میں اس کے  
 لیے چاہے بتاتے، بتاتے اپنا پہل کر رہی تھی۔ اس نے بات  
 ہی کچھ ایسی کی تھی۔ میرا جو گلن گھڑی تھا۔  
 "بائے گل بھی تمکائے گئے کہ قریب قریب بیچ  
 گئی۔" صدمے سے میرا لہو بھر خون خشک ہو گیا تھا۔  
 آنکھوں کے سامنے بی آئے کی مولی سونی کتابیں  
 گھومتی تھیں۔ اگر اس سل بھی کوئی امید کی گمان  
 نظروں آتی تو مجھے قوی نہیں تھا، مہمانے اسلام آباد سے  
 واپس آکر ایڈیشن فارم میرے منہ پر ضرور دے سارا تھا  
 اور مجھ پر "دوستہ دھوئے مجھے اس فارم کو بھرنا تو ضرور  
 ہی تھا۔ درنہ مہمانے دھننی کون کروانا۔  
 "پھوپھو کی خواہش ہے۔ میرے بھائی سے گل کی  
 بات سن جائے مگر میرے اور میری بیٹن جیسے ظالم سانچ  
 کے ہوتے ہوئے بھلا یہ بات سن سکتی ہے۔"  
 "مگر گل میں بھلا کیا کی ہے؟" میں نے مرے  
 سرے لیے میں کہا۔

"نہیں، کی تو کوئی نہیں۔ ہمارے لیے تو تم  
 اچھی ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ ہمیں گھر سنبھالنے کے  
 لیے عورت کی ضرورت ہے نہ کہ کوئی ایسی آہل ہے جو

سارے نظام کو بگاڑ کر رکھ دے۔ اب دیکھیں نا گل  
 سل کے چہ سینے بیٹن ملک کے دو دروں پر رہتی ہے۔  
 ایسے میں ہمارے گھر کی بھلا کیا حالت ہو گی اور دینے  
 بھی گل اپنے کینڈا والے چاہو کے بیٹے میں انٹر فٹ  
 ہے۔ پھوپھو خانا خود چلاتی ہو رہی ہیں۔ خیر ان کا اور  
 گل کا ذاتی معاملہ ہے۔ امید ہے گل پھوپھو کو قائل کر  
 دیں گی۔" کیف نے چوتھا کباب اٹھاتے ہوئے  
 وضاحت کی تھی۔ میں اس کی بات سمجھ کر سر ہلاتے  
 تھی۔

"میں پھوپھو کو لینے کے لیے آیا تھا۔ ایک بھائی  
 کے لیے ایک لڑکی دیکھی تھی مگر وہاں بات بنتے بنتے وہ  
 گئی۔" کیف کا منہ اتر گیا تھا۔  
 "مگر کیسے؟" میں نے بے ساختگی سے پوچھ لیا۔  
 "محترمہ کو کچھ پکنا نہیں آتا۔"  
 "بائے صرف اتنی سی بات؟"

"یہ اتنی سی بات نہیں۔" کیف نے پچن بول  
 اٹھایا اور پھر دوبارہ پلیٹ میں رکھ دیا۔ "جو خاتون بچن  
 کے نام سے گھبراتی ہوں۔ انہیں شوکس میں سجانے  
 کے لیے تو گھر نہیں لے کر جاتا۔"  
 "پھر یہ تو میرے ٹھیک تھا۔" میں نے فوراً اتفاق  
 کر لیا تھا۔ کیف کو دینے بھی بات کرنے کا سلیقہ آتا  
 تھا۔ وہ سستا اچھی طرح سے متاقل کو قائل کر لیتا تھا۔  
 یہی وجہ تھی کہ صرف چند دنوں میں میری کیف کے  
 ساتھ اچھی دوستی ہو گئی تھی اور اس کا بھی زیادہ ترقیت  
 ہمارے گھر میں گزرنے کا تھا۔ کیف نے بڑی مہماور  
 میری مہمانے بھی خاص جان پہچان بتائی تھی۔ ایک تو  
 وہ جلا کا پانی تھا۔ ایسے ایسے لیٹنے اور چلنے چھوڑا کہ  
 جس فہم کر اگا۔ غنہ بے حال ہو جاتا۔ البتہ کیف کی  
 ہمارے گھر میں آمد و رفت رخسانہ آتھی کو پند نہیں  
 آتی تھی۔ اکثر جب کیف صبح ہوتا تو آتی اسے کسی نہ

کسی ہانے جانے نہاتی تھی۔  
 کیف چند ہفتوں کے قیام کی غرض سے یہاں آیا  
 تھا اس کے آفس کا کوئی کام تھا۔



اس دن میں مارکیٹ سے کچھ ضروری سامان لینے  
 کے لیے گئی تو کیف سے بھی ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ دن  
 بعد نظر آیا تھا۔ ان دنوں کام میں بہت مصروف تھا۔  
 اسی لیے پارک میں بھی نہیں آ رہا تھا۔ درنہ تو روزانہ  
 ہی میں اسے قریب پارک میں میٹھے اور مویا گل فون پر  
 مصروف دیکھتی تھی۔ اس وقت بھی اسے فٹ ہاتھ پر  
 چل تھدی کرتے دیکھ کر مجھے بے ساختہ خوشی محسوس  
 ہوتی۔

"گلن تھے اتنے دن؟" میں نے پوچھ پڑے  
 چیلے اس کے ہاتھ میں زبردستی تھمتے ہوئے پوچھا۔  
 "کچھ مصروف تھا۔ تم سناؤ؟ کج گل کیا ہو رہا  
 ہے۔" اس نے بیٹھ کی طرح شانگلے بھرے کنبے میں  
 دریافت کیا۔

"بس وہی بڑھائی کا روٹا۔" میں نے دھکی دل سے  
 بتایا۔ مہمانے آتے ہی میری تھمتی سی جان پر پھر سے  
 کن پوں کا بوجھ لاوا دوا تھا۔ بچل مہمانے جب تک  
 شادی نہیں ہوتی فارغ رہنے سے بہتر ہے مصروف  
 رہو اور سب تو میں بچل سے شادی کے لیے دعا میں  
 کر رہی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس دفعہ بھی میں  
 ہرگز اس نہیں ہو سکوں گی اور گل ہونے سے بہتر تھا  
 میں کسی کی بے رنگ زندگی میں رنگ بھردوں۔ مگر  
 مسئلہ تو صرف یہ تھا کہ خاندان کا کوئی بھی مہمانچ نہیں  
 لایا تھا اور خاندان سے باہر نکلنے جھانکنے کی مہمانے  
 مجھے اجازت نہیں دے رکھی تھی اور نہ ہی میرا ایسا کوئی  
 ارادہ بھی تھا۔

"آئی کاراں تم سے جب کروانے کا ہے؟" کیف  
 کا انداز کچھ سوچا ہوا تھا۔  
 "نہیں تو۔" میں نے فہمی میں سر ہلایا۔  
 "پھر کیا ضرورت ہے؟ خواہ مخواہ تمہیں تکلیف  
 دینے کی۔" وہ منہ ہکا کر بولا۔ "آئی کو چاہیے تمہاری  
 شادی کرویں۔"



"لونی" کو لو مکمل۔ یہاں کوئی پردہ دل آتا تو بات بھی تھی۔ بندہ دودھو کو گھروالوں کو ٹھکری کے لیے منوا لیتا۔ "میں نے کڑھ کر سوچا۔"

"تم بھوک بڑھل کر دو۔" کیف نے اسے نئی راہ دکھانا چاہی تھی۔

"مما ان اوجھے چھکنڈوں سے حائر نہیں ہو سکتیں۔" میں نے ایسی سے لگی میں سر ہلایا۔

"اچھا ایک اور طریقہ بھی ہے تمہارا پر جانو۔"

"مگر کیسے؟"

"بھئی ہر روز صبح سوٹ کا رو دھنا پڑتا۔"

"پھر ممالوگ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر رہا نہیں گی۔"

سارا اجنڈا اچھوت جائے گا۔ "میں نے ایسی سے کہا۔

"تم ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا۔"

"میں نہیں جاؤں گی مگر ڈاکٹر خود چل کر میرے پاس آجائے گا۔" میں بڑاری سے بولی۔ "کچھ اور سوچو۔"

"کہہ دو میری یادداشت چلی گئی ہے۔ ابھی میں گاڑی نکال کر آتا ہوں۔" مصلیٰ سی کر کے بعد تم بے ہوش ہو جانا۔ "اس نے ایک اور بار در زین حل قیٹس کیا جسے سن کر میرا من بن گیا تھا۔

"تاکہ میرا مالی حال ہو تو شروع ہو جائے اور پھر ماما اور پاپا کو پتا چل جائے کہ میں انہیں پریشان کرنے کے لیے ڈرا رہی ہوں۔"

"ایک اور حل بھی ہے میرے پاس۔" وہ پھر سے سون میں تم بولا۔

"جلدی پتاؤ۔" میں بے میری سے بولی۔

"تم خود ہی کرو۔"

"ہائے خود بھی۔" میں گویا بدک کر دو رہی۔

"یعنی مری جاؤں؟ کھنڈ بڑھائی سے بچنے کے لیے؟"

میری آنکھوں کے نیچے گویا باہر نکلتے تھے۔

"نہیں تو۔" وہ گویا جھنجھکا رہا تھا۔ "مرنے کے لیے کون کہہ رہا ہے۔ صرف خود کسی کی کوشش کرنا۔"

میرے سے چھلانگ مار دیتا۔ "وہ اطمینان سے بولا۔

"تاکہ میری ساری ہڈیاں نوٹ جائیں۔ میں نظری

ہو کر بستر سے لگ جاؤں۔" ایسے خوفناک مشورے نے مجھے پیسہ پیسہ کر دیا تھا۔

"بدحوہو حیان سے چھلانگ مارنا تاکہ ہڈیاں ٹوٹنے سے بچ جائیں۔ پس اس کا حویان رکھنا کہ اس منکر کو کھنڈ دیکھ لے۔"

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔" میں نے مشکوک انداز میں اسے گھورا۔ "تم مجھے دیا ہے مجھوانے کے طریقے کیوں بتا رہے ہو۔"

"ایک آخری آئیڈیا بھی ہے میرے ذریعہ دماغ میں۔" کیف نے چنگی بجا کر کہا۔

"مجھے تو معاف کرو۔" میں نے دونوں ہاتھ دوڑے۔ میں سڑک پار کرنے لگی تھی۔

"ارے سن تو دو۔" وہ میرے پیچھے ہٹا جا رہا تھا۔

"کیا ہے؟" میں باراشی سے بغیر رکے بولی۔

"تو تم شادی کرو۔" اس نے پھر سے میرا دل جالایا۔

"کس سے۔" میں نے بغیر سوچے سمجھے دانت پیس کر بولنا شروع کیا تھا۔

"ایک سے۔" وہ میرے سامنے کھڑا ہو کر اطمینان سے کہہ رہا تھا۔ یوں کہ میرا اطمینان پل بھر میں بڑا ہو گیا۔

"مگر۔" میں نے کچھ بولنا چاہا تھا مگر کیف نے گویا ہاتھ اٹھا کر میری بات قطع کر دی۔

"کوئی اگر مگر نہیں۔ کیا میں اور میری ماما تمہارا ہاتھ مانتے آجائیں؟" اب وہ بڑے صاف اور دو ٹوک انداز میں پوچھ رہا تھا اور میری جرت کی گویا اتنا ہو چکی تھی۔

"مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" میں بکا بکا مٹی۔ "چھلانگ پڑنے کے لیے تو کھڑے کھڑے رشتے ٹھیک پاتے ہیں؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا۔" وہ پرجوش سا بولنے لگا۔

"تم ہمارا آئیڈیل ہو سکتی! ہمیں جس لڑکی کی تلاش تھی۔ وہ لڑکی صرف تم ہو سکتی ہو۔ تم میں جو خوبیاں موجود ہیں۔ ہمیں ایسی ہی خوبیوں والی لڑکی کی تلاش تھی۔ میری تلاش یہاں آکر ختم ہو چکی ہے اور میں تمہیں اپنی بھانجی بنانا چاہتا ہوں۔"

ہائے 'مجھے کھڑے کھڑے بارٹ انیک نہ ہو جائے۔ اپنی اپنی تعریفوں نے تو میرے حواس مفلک کر دیے تھے۔ اگر کچھ سنبھل کر کیف کے تاثرات جانچ لیجی تو ضرور ٹھیک جاتی۔ مگر کیا ہے کہ مجھے کسی کو جانچنا پڑھنا یا سمجھنا تو کبھی نہیں آیا۔ میں بے وقوفی کی حد تک سنا ہوں۔ ان دنوں مجھے اپنی بے وقوفی کی خبر نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر وقت بہت بڑا ستار ہے۔ جو باتیں میں باپ اور کتابیں تک سمجھا نہیں سکتیں تھیں باتوں کو وقت ابھی طرح سے ذہن نشین کر دیتا ہے۔ اور وقت کی شاگردی میں رہنا کوئی آسان کام نہیں۔



ان دنوں کی بات ہے۔ جب رخسانہ آنٹی نے اچانک کرینڈا شفت ہو جانے کا اعلان کر دیا تھا۔ شوہر اور بیٹی چونکہ روٹیس میں تھے سو وہ تنہائیں سے کھرا کر کرینڈا چلی گئی تھیں۔ ان کی انیکس میں ابھی تک کیف بائیں بازو پر تھا۔

آنٹی کے چلے جانے کا بیٹا ماما اور میری ممانے خاصا مدد سے لیا تھا۔ عرصہ دراز سے وہ ہمارے پڑوس میں رہ رہی تھیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد یوں لگتا تھا گویا برابر والا کھر ٹالوں میں ڈوب گیا ہے۔ آنٹی چلی گئیں مگر کیف بھی گدھے کے سر سے سینک کی طرح پندہ دنوں کے لیے غائب ہو گیا تھا اور میں ہوا سننے دنوں سے اس کی علانی ہو چکی تھی۔ ایک دو مہینے بھلا کر رہ گئی اور جس دن وہ لوٹیں آیا تھا۔ میں گویا چوتھ بڑی۔

"جہن جہانے لگنا دفع ہو گئے تھے؟"

"سناں تو لینے دو تھا ناہوں۔" وہ کھاس پر کھسکا مار کے جہنہ کیا تھا۔

"جلدی سے بکو۔" میں غصے سے بولی۔ اسو بھائی اور غانی کے بعد کیف ہی تھا جس سے میں اس قدر بے تکلفی سے پیش آتی تھی اور دوسرے ممالو رہا۔

کیف کی شرافت، نجابت کو دیکھ کر مطمئن تھے۔ انہوں نے بھی مجھے کیف سے ملنے اور گپ شپ سے

نہیں روکا تھا اور دے بھی ہم کون سا ہر وقت ملنے کے لیے بے تک رہتے تھے۔ زیادہ تر پارک میں ہی ملاقات ہوتی تھی۔ وہ پارک میں بچوں کے ساتھ دانی والی کھیلتا تھا اور میں ماما کے ہزار مرتبہ مجبور کر کے پرچار پانچ راؤنڈ لینے کے لیے نکل آتی تھی۔ جب تک میں راؤنڈ لیتی تھی۔ اتنی دور تک وہ والی پل کھیلتا رہتا تھا۔ جوں ہی میں ٹھیک پارک پر پہنچ جاتی۔ وہ بال پیس تک کر بھاگ آتا تھا۔

"یو سائے نا میری وہ۔ اس کا ہر تھ ڈے تھا۔" وہ پیسہ صاف کرتا ہوا بولا۔ یو سائس کی وہ تھی یعنی دوست، مگھتیر یا پھر بیوی۔ اس نے بھی "وہ" کی وضاحت نہیں کی تھی۔ "میں نے بھی کبھی وضاحت طلب نہیں کی تھی۔ دراصل مجھے کرینڈے کی کبھی بھی علوت نہیں رہی تھی اور نہ ہی میرا کیف کے ساتھ ایسا کوئی رشتہ تھا جو میں یو سائے کے بارے میں کالھس رہا تھا۔ وہ مجھے خاصا بد روٹھلے اور ساہ مزاج لگا تھا اور ان دنوں تو میری ماما کے کہنے پر وہ مجھے آنا کھس اور انگش ہوئی تھی جس کے ساتھ بڑھاپا تھا اور میں دونوں کے ساتھ یہ بات کہہ سکتی تھی کہ کیف سے اچھا کوئی ترن تک مجھے بڑھاپا تھا اور نہ ہی کچھ سمجھا لیا۔

ماما کیف سے بہت خوش تھیں کیونکہ میرے مستھلی فیسٹ دیکھ کر ماما کا دل خوش ہو گیا تھا اور وہ اس کامیابی کا سارا کریڈٹ کیف کو دے رہی تھیں۔ میری محنت کو وہ کسی کھاتے میں نہیں سمجھتی تھیں۔

"تو پتا کر جاتے۔" میں نے غرا منی دہائی۔

"کیوں جہن؟" اب نے مجھے سس کیا تھا؟ "وہ صاف مجھے چڑا رہا تھا۔

"ہو نہ ہوئی نہیں۔"

"تم تو خوش ہو کی پڑھائی سے جان بھولی رہی اسنے دن۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" میں جڑ بڑھائی۔

"تم کو آواز نہ گرو کی کر آئے؟"

"لڑکی! احترام سے بلایا کرو۔ میں تمہارا استاد ہوں۔"

وہ خواہ مخواہ استاد بنا۔



"تمہاری بوجھ لٹیک ہے؟" میں نے جان کر اسے چھیڑا۔

"ایک دم ٹھیک ہے" فرسٹ کلاس۔ "اور سے آگس کریم والے کو آؤ گئے کراٹھ کیا تھا۔"

"اور تم؟"

"میں تمہارے سامنے ہوں۔" وہ آگس کریم لے آیا تھا۔

"بڑے فریش لگ رہے ہو۔" میں نے اپنا ٹیوٹل فلپور بند کر کے دیکھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"آگس کریم۔"

"مگر مجھے مینگو فلپور پسند نہیں۔" میں نے ناگ چڑھا لی۔

"تو نہ کھاؤ۔ مجھے دے دو۔" وہ اطمینان سے بولا تھا۔

"تم نے ایک بات کرنا تھی سہی۔" اگنی دیر سوچنے کے بعد وہ بہت عجیب کی سے بولا تھا۔ میں کچھ چونک گئی۔

"کیا؟"

"وہ دراصل میری ماما چاہتی ہیں۔" بلا خراس نے کہہ دیا۔

"تو آجائیں۔ اس میں سوچ بچار کرنے والی کیا بات ہے۔" میں اس کی بات کا مقصود نہیں سمجھی۔ دراصل مجھے بات تو کیا ہے سمجھنا اور چہرے پر مہمانی نہیں آتا تھا۔

"میرا مطلب ہے ایک خاص مقصد کے لیے آئیں گی۔" وہ سر ہٹائے گھاس کے ٹکے توجہ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی تنگ گھاس کے ٹکوں کی ایک ڈھیری لگ چکی تھی۔

"کیا مقصد؟" اب میں کچھ کچھ سمجھ تو چکی تھی۔

"آہم مزید وضاحت بھی ضروری تھی۔"

"ایک کے لیے آئیں گی۔ میں نے تمہاری اتنی تعریفیں کی تھیں کہ وہ تم سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئی ہیں۔"

اس نے تعریف کا ایک جہل میری طرف ہیٹک دیا۔

تھا اور میں اس جہل میں الجھنے کے قریب قریب پہنچ چکی تھی۔ دراصل اپنی تعریف کے ناپسند ہوئی ہے اور میری جن خوبیوں کی پیرے گھروالوں کے نزدیک کوئی وقعت یا اہمیت نہیں تھی۔ وہ اسی خوبیوں کو میری نظر میں اور بڑھ کر پیش کرتا تھا۔ دراصل یہ بھی ایک فن ہے۔ شائستگی اور سلیقے کے ساتھ کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا فن۔ یہ ہر بھی کسی کو آتا ہے۔

"تم بہت اچھی کو ٹکٹ کرتی ہو۔" تم میں سلیقہ ہے۔ مگر سنبھل سکتی ہو۔ ماما کہتی ہیں ایک لڑکی کو ہر فن میں مطلق ہونا چاہیے اور وہ عورت ہی کہو گھر واری کے قریب سے واقف نہ ہو۔" وہ اپنے مخصوص دھجے اور پرائیوٹ میں کہہ رہا تھا اور اس کی باتوں سے اس کے عجیب کی تاثیر سے کوئی بھی عقل و فہم والا بندہ قائل ہو سکتا تھا جبکہ میں تو پھر ایک احمق اور بد عوی لڑکی تھی۔

دراصل میرے لیے بے وقوف اور کم عقل جیسے الفاظ ہی مناسب تھے۔ اس وقت میں سفالانہ حد تک خود کو احمق ترین مخلوق بھی کہہ سکتی ہوں۔ ہاں اس وقت مجھے یہ الفاظ بہت ذہریلے اور اناذاق اڑانے والے محسوس ہوئے تھے۔ اب ممانے مجھے نہ آیا کہ

"تم احمق اور پاگل ہو سہی! ہمیں یہ سب تمہارے لیے بہتر نہیں لگ رہا۔"

"آپ تو چاہتی ہی نہیں میں قدر دان لوگوں میں جاؤں جو میرے سلیقے سے حاشا رہیں۔ جو میری ڈگریوں کی بجائے میرے ہاتھ کے دانستے کی تعریف کریں۔ پلیز ماما! میں ملاری زندگی احساس کمتری کے ساتھ نہیں گزار سکتی۔ مجھ سے یہ فائدہ بھی نہیں برداشت ہو سکے گا کہ میں کدہ دہن تھی یا پھر میرا اکیڈمک ریکارڈ اچھا نہیں تھا۔ میں احساس کمتری کا شکار تھی اور اسی خوف کے زیر اثر میں نے کیف کے بجائے حق میں دھوٹ دے کر اپنے لیے ایک بھرے پرے کتے کا انتخاب کر لیا تھا۔

میرا غمزہ پیر کارڈاٹ کیا اور میں خوش قسمتی سے پاس ہو گئی۔ ابھی میری اس خوشی کو سلپیٹ کر رہے تھے کہ ایک نیا واقعہ رونما ہو گیا۔



پوری زندگی میں شاید پہلی مرتبہ میں نے خوشی خوشی کان بیلنے کی تیاری کی تھی اور اس سے پہلے کان کے لیے ضروری چیزوں کی شاپنگ بھی کی تھی۔ ماما اور بڑی ماما اس کلیا پلٹ پر حیران تھیں۔ اور ڈیڈی لیلیا بے انتہا خوش۔

مجھے پون محسوس ہوا تھا کہ میرے اندر تبدیلیوں کی اصل وجہ کیف کی ذات تھی۔ وہ میرے لیے ایک مخلص دوست ثابت ہوا تھا اور اس نے مجھے احساس کمتری کے تصور سے نکل دیا تھا۔ اس نے میری ذات کی اہمیت کو اپنے جائیداد لفظوں کا پیرا بن دے کر مجھے پہلے سے بھی زیادہ فائدہ پہنچا کر دیا تھا۔ یہ بات بھی مجھے بہت بعد میں پتا چلی تھی کہ دراصل کیف کا مقصد مجھے با اعتماد کرنا نہیں بلکہ میرا اعتماد جیتنے کی کوشش کرنا تھا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی اس دن کی جب میں کان بیل جانے سے پہلے صحت پریشاں تیار کر رہی تھی۔ ماما اور بڑی ماما اہل اپنے کمروں میں تھیں۔ ڈیڈی اور لیلیا راز کے بعد سو جاتے تھے۔ جب تک فریش ہو کر سیزنگ آتے تھے۔ میں ان کی پسند کا ناشتہ تیار کر چکی ہوتی تھی۔ یہی میری ددین تھی۔ اس وقت بھی میں نے شمو کے ساتھ مل کر رتن میز پر چائے تھے جب کیف کی کل نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

میں مہمان اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ میرا راز تھا کہ ساتھ ساتھ یونیفارم بھی پیرس کر لوں گی کیونکہ میں باقی تھی کیف کی بات کرنے کا راز رکھتا ہے۔

"استو محترم! اخیریت تو ہے۔ صبح فون کھڑا کیا ہے؟" میں نے مہمان کلن سے لگا کر استری کا پلنگ لگاتے ہوئے کہا۔

"جیس ایسے ہی۔"

"بھونٹ نہ لو۔" مجھے قلعا "یقین نہیں کیا۔"

"سویرے سویرے میں بھونٹ کیوں لاول گاہ۔"

"اتنے بھی تم چے نہیں ہو" دست! میں نے طنز کیا۔

"یہ تو تم نے سچ کہا۔ سو فیصد ٹھیک کہا۔" اس نے فوراً اتفاق کر لیا تھا۔

"ہمیشہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔" میں خواجہ خواجہ اترا لی۔

نہانے کیل وہ ٹپس دیا۔

"تم بہت سادہ ہو۔"

"طنز نہ کرواؤ۔" میں اسے چلانے کی غرض سے بولی تھی۔ شاید وہ میری سادگی پر حوت کر رہا تھا۔

"بہت سادہ ہی ہو۔"

"ٹھیک فرمایا آپ نے۔" میں مزے سے بولی۔

"اور تم بہت جھلاک ہو۔"

"ہاں ماما۔" وہ بھرے مسکرا دیا تھا اور اس کی جھکی کی توازن کر کے نے بس ایسے ہی عالم سے کہنے میں کہہ دیا تھا۔

"اور کبھی کبھی مکی چالاک آپ کے منہ پر بھی آپڑتی ہے۔ خود کو عقل کل نہیں سمجھتا چاہیے۔"

"بڑی عقل کی باتیں کرنے لگی ہو۔" وہ سری طرف حیران ہونے کی لڑاکاری کی گئی تھی۔

"آخر کس استو کی شاکر دی ہیں میں۔" میں نے عاجزی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ سری طرف کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی تھی۔

"فون کیوں کیا تھا؟" میں نے ایک مرتبہ پھر اپنا سوال دہرایا۔ کچرے استری ہو چکے تھے۔ اب میں جوتے نکال رہی تھی۔

"آج ملا تمہارے گھر آؤں گی۔" بلا خراس نے فون کرنے کی وجہ بتائی دی تھی۔ کو بھر کے لیے میں محسوس کی گئی اور میرے دل کی دھڑکنیں بھی بڑھ کر تھیں۔ مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں کیا تھا اور میری خاموشی سے وہ اپنے مطلب کے معنی افادہ کرنے لگا۔

"جیس براگا؟" ملا کہ وہ جانتا تھا کہ مجھے ہرگز برا نہیں لگا مگر بھی اس نے پوچھا۔

"مجھے برا کیوں لگے کہ آخر کل میرے استو محترم

کی ملا آئیں گی۔ مجھے تو ابھی سے میو کی فکر ہو گئی ہے۔" کچھ دیر بعد میں نے کالنی جگے چمکے لمبے میں کہا تھا۔

"اچھی بات ہے۔ اپنی کوٹنگ کے جو ہر دکھا کر ملا کو اپہر لیں کر لے گا۔ شاید مسکرا پاتا تھا۔"

"مجھے بھلا کیا ضرورت ہے۔" میں نے مصنوعی ناراضی سے کہا اور چمکے سے کل منقطع کر دی تھی۔ دراصل میں کچھ گھبرا گئی تھی اور ایسی گھبراہٹ کا شکار بھی نہیں ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے گھبراہٹ کی کیفیت کی ملا کو دیکھ کر کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ ان کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی کہ پہلی نظر میں ہی پتہ چلے کہ گھبراہٹ اور خوف کا شکار ہو جاتا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ ان کی شخصیت کے لیے کون کا سلسلہ مناسب تھا۔ بلا تھار، مذہب، پارعب یا راسرار انہوں نے ماتھے تک پہنچنے لے رکھا تھا۔ ہوں کہ آنکھیں تک دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ جھکا ہوا سر اور جھکی ہوئی آنکھیں۔ خاموش لب، منہ سا چھو، آنکھوں میں سلوک تھی، کوئی سوال نہیں تھا۔

صاف بات تو یہ تھی۔ بڑی ممالور میری ماما کو کیف کی ملا پند نہیں آتی تھیں اور جب گھر والے پند نہیں آتے تھے تو پھر ایک کو دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ڈیڈی کی اور پاپا خاموش تھے۔ فی الحال انہوں نے کوئی رائے نہیں دی تھی اور نہ ہی انہوں نے ایک سے ملنے یا دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ جبکہ ممالور بڑی ممانے صاف کہہ دیا تھا۔

"کالنی بھری پڑی فلیٹ ہے۔ ایک کے پانچ بھائی، ماں اور خیر سے منظور والی بھی موجود ہیں۔ مجھے تو ساتھی کے لیے یہ رشتہ پند نہیں۔ اوپر سے ایک کی ماں نے ہمارے ساتھ کلام تک نہیں کیا۔"

"بڑا خاندان ہوئے میں کیا رالی ہے۔" اس وقت تو ڈیڈی اور پاپا کی موجودگی کے باعث میں کچھ نہیں بولی تھی۔ تاہم ان کے اٹھنے کے فوراً بعد مجھ سے رہا نہیں گیا تھا۔ بول اٹھی۔

"تمہیں کچھ پتا نہیں ساتھی! یہ بیلوں کی بات ہے۔"

ہمارے درمیان ہی رہنے والا۔ ہم جو مناسب سمجھیں گے۔ وہی فیصلہ کریں گے۔" خلاف معمول ممانے مجھے بغیر اپنے آرام سے سمجھانے والے انداز میں کہا تھا۔

"ایک سی تو پوائنٹ مجھے اپنے حق میں مناسب لگا تھا اور آپ اس پر اعتراض کر رہی ہیں۔" میری دیرینہ خواہش پوری ہونے والی تھی۔ کسی بڑے خاندان کا حصہ بننا میرا خواب تھا۔ ایسا گھر جس کے کمین میری تعلیم کی بجائے میرے سلیقے اور سکھانے کے کمرن گائیں اور میں اپنے غلوں اور خدمت گزاروں کے جذبے کی بدولت ان کے دلوں کو بیت لوں اور میں جانتی تھی اس وقت ممالور بڑی ممانے مجھ پر فخر کرتا تھا۔ فی الحال تو وہ میرے اٹھنے پانے کی وجہ سے تذبذب کا شکار تھیں۔

"تم شروع سے ہمارا رُکھنا مائل میں رہنے کی ماری ہو چلا تمہارے لیے ایک پورے گھنے کے ساتھ رہنا بہت مشکل ہو گا۔" بیٹی ممانے مجھے سمجھانا چاہا تھا کہ میں نے ان کی بات پر دھیان نہیں دیا۔

"ماما! یہ پوائنٹ تو بہت دیک ہے۔ میں ہر طرح کے مائل میں اپنے جیسے کر لوں گی۔" بات تو کلنی بے شری والی تھی۔ اپنے پڑپونل پر یوں کھلی ڈلی گفتگو کرنا گھر میں مشرقی لڑکی بننے کی لواکاری کر کے خاموش رہنے کے پتھر میں اتنا اچھا پڑپونل ہاتھ سے نہیں جالے دینا چاہتی تھی۔ اب تو کوئی ڈھنگ کا پڑپونل آیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے جو خواتین ہمارے گھر آچکی تھیں۔ وہ سب سے پہلے میرے میزک میں گر پڑے اور نمبر پچھنے لگی تھیں اور جنہیں خبر ہو جاتی تھی کہ میں نے میزک میں سال میں کچھ کیا ہے۔ تو وہ مڑک دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کرتی تھیں۔

"پلیز ماما! محض اس وجہ سے آپ کیف کے گھر والوں کو انکار مت کیجیے گا۔" میں نے احتجاج کیا تھا اور اب تو مجھے پورا یقین تھا کہ ماما کی تاثر ہی نہیں کی مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا، بلکہ اس کے برعکس ممانے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور بھرائی توازن میں بولیں۔

"بنا! ہم تمہارے لیے ہر چیز پر کٹ دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم ہماری انگوٹھی بنی ہو۔ ہمیں پاپا اپنی اولاد کے لیے حساس ہوتے ہیں۔" ماما بہت دیر تک مجھے سمجھاتی بھلائی رہی تھیں۔ دنانے کی اونچی نیچ۔ اتار چڑھاؤ ڈانڈ کی کے نشیب و فراز۔ اور میں خاموشی سے سر جھکا کر سنتی رہی تھی۔ مگر مواصل پھر بھی ایک کے حق میں دوشدے رہا تھا۔

"ایک دفعہ دیکھ لینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔" بہت دیر سوچنے کے بعد بڑی ممانے دھیمی توازن میں کہا تھا۔

"مجھے سفینہ (کیف کی ملا) کا رویہ بہت عجیب لگا تھا بھابھی!۔" ممالور بڑی ممانا بہت دیر گفتگو کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں سو میں پچھلے سے اٹھ گئی۔



آنے والے بہت سارے دن اسی سوچ بچار میں گزر گئے تھے۔ ممالوگ ایک دفعہ جہلم جا کر ایک کو بھی دیکھ آئی تھیں۔ ڈیڈی اور پاپا کے علاوہ اسو بھائی اور علاو بھائی بھی ایک سے مل کر آئے تھے اور وہ انہیں ہر لحاظ سے اچھا لگا تھا۔

"اپنی ماں کی طرح ہے۔" مذہب، خاموش۔ بلا تھار اور۔ "تم ماما کا ایک کے لیے بہنو تھا۔ ماما کچھ کہتے کہتے رک گئی تھیں اور میں ان کی خاموشی سے بے چین ہو گئی۔

"اور کیا بھلا؟ راسرار۔؟" میری زبان بھلا رک گئی تھی۔ ممانے مجھے بیٹھ کی طرح گھورتی سے نوازا تھا۔

"نہیں۔ بہت سچا مزاج۔" ماما مجھے نہیں بلکہ خالی کوتاہی تھیں جو خرابی طبیعت کی وجہ سے جہلم نہیں جاسکتی تھی اور اب شکے لینے کے لیے صبح صبح اسو بھائی کے ساتھ پھل ہو گئی تھی۔ اسو بھائی اسے ڈراپ کر کے اپنے آفس چلے گئے تھے۔

"ایک کا بوس اچھا چل رہا ہے ماشاء اللہ ہے" اس نے چند سال میں ہی بہت ترقی کی ہے۔" بڑی ماما

ایک سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئی تھیں۔

"شکل و صورت کیسی ہے۔ گورائے؟ کلا ہے؟ سارلا ہے؟ کیسا ہے؟" خلی نے جمل کر پوچھا تھا۔ اب کے ممانے خلی کو گھورا۔

"بہت خوش شکل ہے۔ ساتھی کے ساتھ بیچے گا۔" جواب بڑی ممانی طرف سے آیا تھا اور اس جواب نے مجھے بھی مطمئن کر دیا تھا۔

ایک سے چھوٹے چار اور بھائی تھے۔ سب سے بڑا ایک تھا اور اس کے بعد کیف، عیون، فائز اور اشعر تھے۔ اور یہ بات سن کر گم حیران رہ گئے تھے کہ عیون اور فائز دونوں شادی شدہ تھے۔ ممانے اس بات پر بھی خلاصا اعتراض کیا تھا کہ بیلوں کو چھوڑ کر چھوٹے دونوں کی شادی کیوں کی ہے۔ سو یہ میری ماما کو اعتراضات تو اور بھی بے شمار تھے مگر مسئلہ یہ تھا کہ ماما کو اپنی قدر سے قربی مائل، پتا کتنی سی بیٹی کے لیے ایک جیسا سہارا، خیر اور لائق خالق لڑکا پند آیا تھا۔ سو بھرا پر اکتیہ بھی ممانے نظرانہ انداز کر دیا تھا اور سفینہ آجی کارویہ بھی۔

بیلوں کے درمیان قیام معاملات طے پا گئے تھے۔ اب مجھے بی اے کی بجائے بی اے ہی کرنا تھا مگر بھانے کیوں سب کچھ حسب مشاہوے کے بلو جو اندر نہیں عجیب سی بے قراری چنگیاں بھرنے لگی تھی اور میں کالنی دن تک تو یہی سمجھتی رہی تھی کہ شاید ممالور پاپا سے دوری کا احساس دل میں چھپن دے رہا ہے۔ دل کو اسی کی وجہ سے چاروں میں پسٹ رہا ہے مگر یہ احساس پاپا کے گھر سے لے کر ایک کے گھر تک میرے ساتھ رہا تھا۔ مگر اس سے بھی پہلے کچھ اضطراب تو میرے اندر خود بخود بھرنے لگا تھا۔

ایک دن کیف چلا آیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ جا کر اپنی شادی کی شاپنگ کر لوں۔ اس میں کوئی اعتراض والی بات بھی نہیں تھی۔ سو ممانے مجھے اجازت دے دی تھی۔

تقریباً تین دن تک شاپنگ کا سلسلہ چلتا رہا تھا۔ اگرچہ شاپنگ بھی میں نے نہ ہونے کے برابر کی تھی۔



ایک تو موت میں کافی جگہ چھٹکے اور تم قیامت کے کپڑے پہنے تھے۔ دوسرے چھٹے دیسے بھی بھاری لباس سے اچھن بوتی تھی اور جب لپٹنے کی بدلی آتی تو کیف نے مجھ سے پوچھا۔  
 ”کنگا کیا ہو چاہیے؟“  
 ”کنگا نہیں۔“  
 ”تو پھر؟“

”میں کچھ اور لوں گی۔“ میں نے بھاری بھر کم ہنستے دیکھ کر ایک ہانکا سانس کلام والا شلوار قمیض پسند کر لیا تھا۔

”شانگ پنگ لے لو ایک کو یہ کھر پسند ہے۔“ کیف نے مجھے سرخ رنگ کا انتخاب کرنے دیکھ کر فوراً کہا تھا۔ حالانکہ سرخ رنگ کو میں اپنا کئی کھر سمجھتی تھی۔ یہ رنگ میرا پسندیدہ تھا مگر اس کے بلونود میں نے ایک کی پسند کو اولیت دی تھی۔

شانگ پنگ کے دوران ہوسا ہمارے ساتھ رہی تھی۔ یوسا کیف کی کرن اور منجیر تھی اور جس طرح کیف اس پر دل کھول کر خرچ کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ کیف ہوسا سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ کیف کی ہوسا کے لیے محبت اس کے ہر ہر تار سے ظاہر ہو رہی تھی اور میں وہ وقت سے کہہ سکتی تھی کہ اتنی خریداری میں نے نہیں کی تھی جس قدر یوسا نے کی تھی۔ مجھے تریں کپڑے اور سونے کے زیورات اس کے علاوہ بھی نبھائے کیا کچھ۔

میرا سلان کیف نے میرے حوالے کر دیا تھا اور یوسا بوری گاڑی اپنی چڑیوں سے بھر کر جھلم جھلی مچی۔ حالانکہ جب میں برائینڈل وریس خرید رہی تھی تب کیف برابر مجھے حشر رہا تھا۔

”ہاتھ ہولا رکھنا فریڈ! اتھارے انہوں نے میری جیب میں کچھ خاص رقم بھر کر نہیں بھیجا۔“

”اپنے بھائی سے کتنا شادی کر رہا ہے یا پھر ہاتھ ڈے صلہ بیوہ کر رہا ہے۔“ میں نے بھنا کر کہا تھا۔

اگرچہ مجھے خود ان باتوں کا خاصا خیال تھا مگر کیف کا بار بار دہانا مجھ سے برا لگ رہا تھا۔  
 پھر ایک دن کیف نے اچانک فون کر کے مجھے حیران کر دیا۔ ”ایک سے بات کر دو؟“ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

”میں۔۔۔ مگر کون؟“ میں گھبرا اٹھی۔ شادی میں چند دن تو رہ گئے تھے اور توج سے پہلے اوجھ سے کوئی ایسا معاملہ سامنے نہیں آیا تھا اور پھر تمنا سے پوچھنے بغیر میں بھلا کیسے بات کر سکتی تھی۔

”بس ایسے ہی تم میں کرنا چاہتیں تو کوئی بات نہیں۔“ کیف نے مزید کچھ سننے سے پہلے فون رکھ بھی دیا تھا۔ آج تو تھا کہ کیف کو بھی میں سمجھ نہیں پاتی تھی۔ عجیب سا بندہ تھا۔ گھڑی میں تو کہ گھڑی میں ہاٹ۔

ان ہی انجھی سلجھی سوچوں سمیت شادی کا دن بھی آگیا تھا۔ اس دن عالم لڑکیوں کی طرح مجھ پر بھی گھبراہٹ سوار تھی اور آٹو بھی وقتاً فوقتاً بغیر کسی وجہ کے گرتے جا رہے تھے۔ ممال اور بڑی مہمانی میرے سامنے خود کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر یہ کوشش کبھی کبھی باہم ہو جاتی تھی۔ ہر ایک مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ کمرے کے لان میں شامیانے لگے تھے۔ رات کو مندی کی تقریب کا انتظام ہوٹل میں تھا۔ البتہ بڑی مہمانی خواہش تھی کہ رخصتی کسی ہوٹل سے نہیں بلکہ گھر سے ہو چاہیے۔

نکلنے سے کچھ دیر پہلے میں نے عجیب سی دلی دلی سرگوشی سنیں اور کچھ دیر بعد مکمل گری بات سامنے آگئی۔ کیف نے مہمانوں سے بڑے واضح لفظوں میں کہا تھا۔

”آئی بی! آپ نکاح نامے میں حق مہر کے طور پر ایک سے کچھ بھی لکھوائیں۔ ساقی کے تحفہ کے طور پر۔“

”پرینا! اس کی کیا ضرورت ہے۔ جو کچھ شرعی طور پر ہو گا۔ ہمیں منظور ہے۔“ سمانے سلیقے سے کہا تھا۔

اگرچہ بات تو درست تھی مگر میرے والدین اس چیز کو کافی غیر مناسب سمجھتے تھے۔

”نہیں آئی! ضرورت ہے۔ یہ ساقی کا حق ہے۔“ وہ اپنی بات پر زور دے کر بولا تھا۔ ”میں ایک سے بات کرنا ہوں۔“ وہ اپنا گھر چار فریجٹائز میں سے دو فریجٹائز اور کارخانہ ساقی کے نام لکھ دے۔ یہ ساقی کا حق مہر ہو گا۔“

”مگر یہ تو بہت زیادہ ہے۔“ سمانا گھبرا کر بولیں۔  
 ”اتنا بھی زیادہ نہیں۔ میں نے کمانا یہ ساجیہ کا حق ہے۔“

اس کا اندازہ دو ٹوک قسم کا تھا۔ ساجیہ سی ہو گئی تھیں۔ اگرچہ مجھے بھی یہ حق مہر بہت زیادہ لگ رہا تھا مگر میں بولنے کی پوزیشن میں نہیں تھی ورنہ ضرور بول اٹھتی۔

”ایک کیا کہے گا۔ ہم کس قدر لالچی ہیں۔“ مجھے یہی سوچ تار سے ڈال رہی تھی۔ میں ممال کو منع کرنا چاہتی تھی مگر کیا اور ڈیڑی کے ساتھ مولوی صاحب کو دلچ کر خاموش ہو گئی تھی۔ اگرچہ سننے میں آیا تھا کہ ایک نے کیف کے اس مطالبے پر کافی ناگوارتہ کا اظہار کیا تھا۔ وہ دن نہیں رہا تھا مگر نبھانے کیسے کیف نے اسے متاثر ہی دم لیا۔ کیف کے غلوں اور بہہ رواں فطرت کی میں کچھ اور قائل ہو گئی تھی۔

سینہ پیچہ یعنی کیف کی مالا میں وقت بھی کچھ نہیں بولی تھیں۔ تب حق مہر کے متعلق دلی دلی سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔ تب ہی وہ خاموش اور سرگوشیاں بیٹھی رہی تھیں۔ نہ ان سے کسی نے پوچھا تھا نہ مشورہ لیا اور نہ ہی بڑھ چڑھ کر انہوں نے بولنے کی کوشش کی تھی۔ ایک چپ تھی ان کی جو گھر آنے کے بعد بھی نہیں بولی تھی۔

بس انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر خاموشیوں سے ایک دعا دی تھی اور میرے لیے ان کی یہ دعا پوری زندگی کا حاصل تھی۔

”سدا اسکی اور آیاں ہو۔“



ایک کے ساتھ نئی زندگی کی شروعات نے میرے سارے خدشات دور کر دیے تھے۔ مجھے خوف تھا کہ وہ ضرور حق مہر میں لکھوائی جائے والی لمبی چوڑی جائیداد کے طعنے دے گا جسے گایا کبھی کبھار فخر کی مار مارے گا۔ تاہم ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ میرے لیے ٹوٹ کر چاہنے والا شہر ثابت ہوا تھا اور اس کی محبت پر پہلے روز ہی میرا دل ایمان لے آیا تھا۔ سب سے بڑی ضرورت بات یہ تھی کہ اس نے میرے تعلیمی ریکارڈز کا ریکارڈ ہرگز نہیں لٹکایا تھا بلکہ اس معاملے میں بھی اس نے کوئی سوال جواب نہیں کیا تھا۔ عموماً وہ زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ اپنے بھائیوں کے ساتھ بھی اس کی سبب نہ ہونے کے برابر تھی مگر اس کے بلونود وہ اپنی ماں اور بھائیوں سے سب سے محبت کرتا تھا اور مجھ سے بھی اس نے صرف اتنی کہا تھا۔

”ساجیہ! مجھے امید ہے تم میرے گھر میں ایک اچھا اضافہ ثابت ہو گی۔“ پلیز! امیری میں اور بھائیوں کی عزت کرنا۔ ان کا خیال رکھنا۔ اس گھر میں سب سے مظلوم ہستی میری داہری ہیں۔ میں تم پر کوئی بوجھ نہیں ڈال رہا۔ بس دن میں کبھی کبھار ان کی خبر گیری کر لیا کرتا اور دوسرے نمبر پر میری ماں ہیں۔ ان کی ذات بھی قابل توجہ ہے۔ تمہارا وقت انہیں بھی دے دیا کرتا اور جس ’میرا تم سے کوئی مطالبہ نہیں۔ میں ہمیشہ تم سے مکالمہ رہوں گا اور تم سے محبت کرتا رہوں گا۔ بس ایک وعدہ کرو۔ کبھی بھی اپنے دل کو کسی اور کے خیال سے آلودہ نہیں کرو گی۔ میں سب کچھ برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں مگر بے وفائی ہرگز نہیں۔ جس کیف نے میرے لیے پسند کیا ہے اور مجھے امید ہے کہ تم ہم سب کے حق میں بہتر ثابت ہو گی۔ ہم بھائیوں میں بہت پیار ہے۔ ہمارے اس پیار کو ہمیشہ قائم رکھنے کی کوشش کرنا۔“

میں نے لہجہ میں سر ہلا کر اسے سرشار کر دیا تھا۔

میرے لیے ایک ہی ہر بات حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ جس طرح ایک نے مجھے اپنے دل میں جگہ دی تھی اسی طرح وہ بھی میرے دل کے ہر گوشے میں رہ گیا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ بیش چاہے جانے کے لائق بہت اچھا بہت نیک بہرہ ور۔ ایسے ہی لوگ بیش دلوں پر حکومت کرنے کا فن رکھتے ہیں۔ رشتہ آئی اسی لیے تو ایک کو اپنا دل دانا چاہتی تھیں۔ جب اور جسے دل برباد ہو گئیں تو پھر پتی اور شوہر کے پاس چلی گئیں۔ ایک اور کیف کے علاوہ اعلیٰ تعلیم کسی اور نے حاصل نہیں کی تھی۔ عورت اور فائز دونوں نے انٹر کے بعد شادی کر لی تھی اور دونوں ہی ایک کے کاروبار سے منسلک ہو گئے تھے۔ دونوں کو مناسب جاب ایک نے ہی مل سکی تھی۔ مگر وہ اپنی پہلی جگہ خود اٹھا گئیں۔ انٹر میں تعلیم ختم کر کے ہی گھر آتا تھا۔ البتہ عورت اور فائز کی یہاں زیادہ دیر گھر میں ہی رہتی تھیں اور کل سے بھی بڑھ کر سست اور کھلی تھیں۔ پورا گھر بچہ بی کے کندھوں پر تھا۔ وہ سیاہ و سفید کی پاک تھیں۔ جو مرضی پا کر پتی تھیں اور جیسا مرضی پکا نہیں دے سب میرا اور شکر کر کے کھا لیتے تھے کہ گھر کی خواتین نے بھی ضرورت کے وقت بھی کچن میں نہیں بھانکا تھا۔

کیف ٹھیک ہی کہتا تھا۔ ان کے گھر میں سلفے قرینے کی بہت کمی تھی۔ تاہم بات سراسر غلط تھی کہ کچن کیف سنبھالتا ہے۔ شاید اس وقت خدا کا "اس" نے کہہ دیا ہو گا تاہم میں تو صرف بھرتی کو ہی ہر ایک پر رعب مارتے اور کھانوں کا دانا دیتے دیکھ رہی تھی۔ ایک بہت مصروف رہتا تھا اس کا کام ہی ایسا تھا کہ وہ رات سے پہلے گھر نہیں آتا تھا۔ بھرتی نے بتایا کہ ایک کھانا ہرے کھا لیتا ہے اور مجھے سالن کے ٹائم پر ملو بے دیکھ کر ان کی بات پر یقین آ گیا تھا۔ ایسے ملو بے سے باہر کا کھانا ہی بہتر تھا۔ مگر گھر کے مو

ہے چارے بھلا کیا کرتے۔

دنیا کو خیر یا شر کہہ دیا تھا۔ ایک عرصے سے ان کی یہی رو میں تھی۔ تینوں وقت کا کھانا انہیں کمرے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ اسی طرح بڑوں کا پھانچا سی، آثار قدیمہ جیسی راوی بھی پلنگ پر چت لیٹے جس بھت کو گھورتی رہتی تھیں اور جب اس کمرے سے تھک ہار جاتیں تو پھر گہری نیند میں گم ہو جاتیں۔ بھرتی جیسے تیسے بد مزاجی خفی انہیں پٹا جاتی تھیں۔

نیا اور سی نے بھی ساس اور راوی ساس کے کمرے میں بھانکنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ سارا دن اسے ای لگتے اپنے اپنے کمروں میں بندنی دی دیکھنے میں مصروف رہتی تھیں۔ دونوں کے پاس ایک ایک بچہ تھا اور ان کی اپنی بے شمار مصروفیات تھیں۔ مگر بر بھلا کیوں توجہ دیتیں۔ سونے کھانے اور آرام کرنے کے علاوہ ان کا تیسرا محبوب ترین مشغلہ پارلر کے چکر لگانا تھا۔ صحت اور حسن کو نکھارنے کے علاوہ کوئی اور کام ان کے پاس نہیں تھا۔

اس گھر کی خواتین کی رو میں دیکھ کر تو مجھے قش آنے لگے تھے۔

"نیا اور سی گھر کی طرف توجہ کیوں نہیں دیتیں۔"

میں پورا ہنستے ہنستے کہہ رہے تھے کہ بعد والہیں آئی تھی۔ یہاں آتے ہی اسی گند کی غلاطی نے استقبال کیا تھا۔ رانی اگرچہ صفائی کر کے تھی مگر پھر بھی جگہ جگہ فوٹ کے چھلکے اور پتھروں کے ریت پرے تھے۔ حتیٰ کہ صوفوں کے اوپر مسکنس کا چورہ بھی شکن سے بکھرا ہوا تھا۔ اگر لڑکیاں نہیں بچہ کریت ہو جاگی تھی تو پھر جمونے برتن اور چھلکے سینے میں کتنا نام لگ جاتا تھا۔ رات کو ایک اپنے مخصوص ٹائم یعنی ساڑھے گیارہ بجے گھر آیا تو میں نے کافی ٹاکواری سے اپنے بھرے دل کو خالی کرنا چاہا تھا۔

"وہ اس گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھتیں مہو اس لیے۔"

وہ فریٹ ہو کر بیڑ پر جمی اور اڑ ہو گیا تھا۔ ایک کو اور مجھے بھی لی دی سے دلچسپی نہیں تھی۔ سو ہمارے کمرے کا لی وی خاموش رہتا تھا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔" میں پریشان تھی۔ "جس گھر میں قیام ہو چاہیے وہ کرانے کا ہی کیوں نہ ہو اسے اپنا سمجھ کر اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کرنا چاہیے۔"

"یہ تو تمہاری سوچ ہے۔" اس نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

"مگر انہیں بھی ایسا سوچنا چاہیے۔ رانی ایک دفعہ صفائی کر جاتی ہے۔ پورا دن ہمیں خود ہی گھر کو صفائی رکھنا ہوتا ہے۔ اگر گند کی یا پھلارا انہیں سمیٹیں گے تو اگلے دن تک بھلا کیا حالت ہوتی ہوگی۔ بچے اس گند کی میں کھینچتے تھے۔ فرش سے گندی چیزیں اٹھا کر کھاتے ہیں۔ اسی لیے آئے دن ڈاکٹروں کے پاس جاتی رہتی ہیں۔" میں نے کلس کر کہا تھا۔ اپنا سچا سچا سیکے والا کہہ دیکھ کر آئی تھی سو اس لیے طبیعت خاصی اوبھ رہی تھی کیونکہ میرے پیچھے اس کمرے کی صفائی تک نہیں کروائی گئی تھی۔ فریٹ پر گرد کی ایک تر چبک رہی تھی۔

"اب بھلا میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ عورت اور فائز کو چاہیے عورتوں کی طرف دھیان دیں۔ بیویوں سے انہیں کچھ اور نہ سہی کم از کم کچن کی طرف توجہ خود دے لیا کریں۔ بیٹے بھر کا راشن دس دن میں اڑ جاتا ہے۔ ظاہر ہے جب گھر کی خواتین توجہ نہیں دیں گی تو ہر چیز کو ضائع کر دیا جائے گا مگر یہاں شروع سے ہی ایسے حالات ہیں۔ راوی اور ماسیڈ بھی ساری خواتین تھیں۔ پکانا، کھانا، آٹا انہیں تھا۔ شروع سے ہی بھرتی سنبھالتی ہیں۔ نیا اور سی نے یہی کہہ دیکھا ہے۔ سو انہیں جان مارنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ خیر چھوٹو! ان باتوں کو یہ بتاؤ گھر والے کیسے ہیں بہتر میں پر اہم تو نہیں ہوئی؟"

ایک نے بات بدل دی تھی۔ جس بات کا کوئی نتیجہ نہیں لگتا تھا۔ اس پر بھلا بحث میں وقت کیوں ضائع کیا جانا۔ اب وہ میرا حال احوال پوچھ رہا تھا۔ وہ میرے متعلق چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بہت دھیان سے سنتا تھا۔ اگرچہ چھوڑ کر تو مجھے ایک ہی کیا تھا تاہم واپس میں ذرا میرے ساتھ آئی تھی۔ ایک ہنستے تھک

رہتا تو نہیں تھا مگر چونکہ عورتوں کی پہلی سمیت کراچی سے آگئے تھے سو ان کے بچوں کے لیے میں وہاں پرک تھی تھی۔ حالانکہ میرا ابھی مزید رہنے کا ارادہ تھا مگر ایک نے مجھے ایک دن بھی اوپر نہیں رہنے دیا تھا۔

"مسٹر تو کوئی نہیں تھا مگر میں نے آپ کو بہت مس کیا۔" میں ہونٹوں میں مسکان دے کر مڑے سے بولی۔

اگرچہ میں نے سچائی کو ظاہر کیا تھا مگر ایک میرے اس بچ کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"سراسر جھوٹ۔ اگر میں کرنا ہی تھا تو میرے ساتھ یہ واپس آجاتی۔"

"تو رے وہ باہر آگئی ہوں جناب۔ صرف ایک ہفتے کے لیے۔"

"اور میرے لیے یہ ہفتہ پورے دو ماہ کے برابر تھا۔ دن گزر رہا تھا۔ رات۔" وہ میری طرف دیکھ کر دلکشی سے مسکرایا۔

"سراسر جھوٹ۔ اگر ایسی بات تھی تو آجائے۔"

میں ملاؤ سے بولی۔

"بس بیٹی کیا کریں۔ مجبوری تھی۔" ایک نے لعلی کی تو پھر۔

"نہیں مجبوری۔" میں نے آنکھیں دکھائیں۔

"یہی جان! کاروبار سلطنت کی مجبوریوں کیا کم ہیں۔ ذرا اور حرا و حرو چلوں تو لاکھوں کا نقصان ہو جاتا ہے۔" وہ دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھے بولا تھا۔

"کیوں بھلا فائز اور عورتوں کو یہ ہوتے تو ہیں۔"

"مگر وہ اتنی توجہ نہیں دیتے۔ لاکھوں کا نقصان ان کی نظر میں کچھ نہیں ہوتا۔ اگر میری غیر موجودگی میں کچھ لوٹا کچھ ہو جائے تو وہ لوگ سنبھال نہیں سکتے ابھی تا بھگت ہیں۔ آہستہ آہستہ سب سمجھ جائیں گے۔"

وہ حد درجہ سنجیدہ تھا اور خاموش ہی رہتا تھا۔ کمزور تھا مگر بہت اچھا بولتا۔ زیادہ تر میں ہی اسے بولنے پر اکساتی تھی۔ خود سے کبھی بھی گفتگو کا آغاز نہیں کرتا تھا۔ ہاں محبت لٹانے کے معاملے میں وہ کجوس ہرگز نہیں تھا اور افسار کے معاملے میں تو بالکل نہیں۔ اپنے مخصوص لمبے میں دھیما دھیما بولتا وہ سیدھا حال



اس گھر کے افراد کا ایک مسئلہ تو یہ تھا کہ سب لوگ

256 دسمبر 2011ء

خواتین ڈائجسٹ

25 دسمبر 2011

"اور تم کیا کرنے لگی ہو؟"

"کھانے کی تیاری۔" میں نے ایک اور پکٹ فرور میں سے نکالے ہوئے بتایا۔

"یہ کام تجھ کی سرپرست پر نہیں تھا۔"

"کیوں؟ میں نہیں کر سکتی کیا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"بہت اچھا کرتی ہو۔ مگر خیر چھوڑو۔ یہ تلو تم نے اور ایک نے اپنی سون کے لیے نہیں جانا۔" وہ کچھ کہتے کہتے پلٹ گیا تھا۔

"میں بھلا اپنی سون کے لیے جانا ضروری ہے؟"

"بہت ضروری ہے۔ تم لوگوں کو کیس کھونٹے پھرے ضرور جانا چاہیے۔" وہ اسٹول کھینچ کر بیٹھ گیا تھا۔

"یعنی اس کا ابھی مزید گفتگو کرنے کا ارادہ تھا۔"

"تیس ایک سے بات کرنا چاہیے تھی۔" وہ مجھے اکسا رہا تھا۔

"دیکھو کی۔ ایک فارغ ہوں گے تب ہی تو کیس جانیں گے۔" میں نے نوکری میں سے پیاز نکال کر چیلنا شروع کر دی تھی۔

"اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرو گی تو پھر یوں ہی بیٹھی رہ جاؤ گی۔" میں نے فارغ ہونے والا یہ کارہ بار یہ

روپیہ چیرے آتے جان سے زیادہ پیارا ہے اور اور

ہونے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اب یہ

تیساری محبت پر منحصر ہے کہ تم اپنی بات اس سے منوا

سکتی ہو یا نہیں۔" وہ بڑے عجیب سے لہجے میں کہہ رہا

تھا۔ "اگر تو تیساری محبت کا پورا بھاری ہوا پھر تو سمجھو

تم کا پیار ہو سکتا۔"

"مجھے ایک کی محبت پر شک نہیں ہے۔ اگر وہ

فارغ ہوئے تو ضرور میری بات مان لیں گے مگر۔ مجھے

ان کی ذہن داروں کا احساس ہے۔ سو اس لیے میں اپنی

وجہ سے ایک کو پریشان نہیں کر سکتی۔" میرا انداز وہ

لوک خم کا خاصا اور رو دکھا تھا۔ تب ہی تو کیف کا لہجہ

بھی بدل گیا اور گفتگو کا انداز بھی۔

"انہی مشق کا اظہار کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

وہی سی تیساری دامن میں پھنس رہا ہے۔"

"کیف؟" میں اس کے الفاظ سن کر رنگ نہ مٹی تھی۔

"تم کس قسم کی پلٹ گئی ہو؟" وہ زور سے پوچھا۔

"میں نے کچھ غلط کیا؟" وہ فوراً "معلوم نہیں کیا تھا۔"

"میرے بھائی کو محبت کے دامن میں لہجھا تو لیا ہے۔

ویسے میں چاہتا بھی کی تھا۔"

"کیف؟" اور اسوج کچھ کربات کرو۔ میں اس وقت

تیساری بڑی بھائی ہوں۔ میرا اور تیسارا رشتہ بدل چکا

ہے۔" میں نے ہنسنے اپنا قصہ ضبط کیا تھا۔

"تماری دوستی کا رشتہ تو ابھی تک قائم و دائم ہے۔

دوست ہونے کے نامے تم میرا ساتھ دو گی نہ۔" وہ اسے

کھدوے لیے میں بولا تھا کہ میرا دل کاپ کر رہا ہے۔

"لوگوں سے دیکھتی؟"

"وہی تو میرے تیسارے درمیان تھی۔" وہ چپا

چپا کر بولا۔

"تم آخر چاہتے کیا ہو؟" میں اس کے بدلے انداز

دیکھ کر تنگ مٹی تھی۔ وہ مذاق کے رنگ میں بات نہیں

کر رہا تھا۔ اس کا لہجہ کمر طویہ کاٹ دار خم کا تھا۔

میری ریزہ کی ہڈی سننا لگی۔

"اب کیا ہے ناؤ افش مندان سوال۔ میں بھلا کیا

چاہتا ہوں۔" وہ میرے سے مسکرایا تھا اور پھر بولنے

لگا۔ اور میرا رنگ کھلے۔ کھنفتی ہوتا جا رہا تھا۔

\*\*\*

"نا اور بھی بھی ان دونوں اپنے خیرے سے باہر نکل

آئی تھیں اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ دونوں نے

گھر چلے اور میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ اگر میں

کہنے دھونے کے لیے مٹھین لگاتی تو کسی یا ناؤرا"

ساتھ دینے کے لیے آجاتی تھیں۔ اسی طرح اگر میں

ساں پکاری ہوئی تو تیار تین دھونے کھڑی ہو جاتی۔ آہ

گوشتہ دیتی تھی کہ روٹی بھی پکا دیتی۔ مجھ کی گویا

چوٹی ہو گئی تھی۔ اب وہ صرف سودا سلف لا کر دیتی

تھیں۔

"دوسری طرف سی کہنے استری کرتی۔ مڑوں کے

اگ رکھتی۔ خواہن کے اگ رکھے جاتے۔ ان

وہی سی تیساری دامن میں پھنس رہا ہے۔"

دونوں کی شخصیت میں اور آنے والی تبدیلیوں نے فائر

اور عوان کو بھی چو لکھا تھا اور وہ ان دونوں کے سدحر

جانے کا تمام تر کڑنٹ بھنڈے تھے۔

اور کیف کے گنن میں بھی نہیں تھا کہ سب گھر

والے اس طرح سے میرے گریوہ ہو جائیں گے۔ لہذا

اور داری کچھ کہتی تو نہیں تھیں مگر ان کی آنکھوں میں

موجودہ شکر گزاری کے رنگ میری نظروں سے اوپر

نہیں تھے۔

"نا اور سی فیشن سے لے کر اس کی کیریکر ہر

مشورہ مجھ سے لینے کے لیے بھائی بھائی مل آتی تھیں۔

ان کے خیال میں میرے پاس معلومات کا بہت بڑا

خزینہ موجود ہے اور میں بڑے شہر سے آنی تھی سو مجھے

پرفیشن کے بارے میں علم تھا۔ یہ تو نا اور سی کی سہولگی

میں حالانکہ مجھے بدلے فیشن کا کچھ پتا نہیں تھا مگر میں

جانی سے مفید مشورے لے کر انہیں معلومات فراہم

کرتی رہتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ دونوں میرے اور

بھی قریب آ گئی تھیں۔

ان کا زیادہ وقت اب میرے ساتھ گزرتا تھا۔ مل

جل کر محبت چٹ کلم بھی ہو جاتے تھے۔ مگر بھی صاف

ستھرا ہو جاتا تھا اور پھر کافی دیر تک شب بھی چلتی رہتی۔

وہ دونوں صرف سونے کے لیے اپنے کمرے میں جاتی

تھیں۔ زیادہ تر لڑکھانچ میں ہی فیکری رہیں۔

اس دن ابھی کی اپنی بیٹی کا مجھ سے پوچھ کر

فراک سی رہی تھی اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہی

تھی۔ ایک دم میں نے میٹھن بچھ سے رکھ کر کچھ

سوچے ہوئے تھی سے پوچھا۔

"بہت دن ہوئے کیف مگر نہیں آیا۔"

"وہ مگر کہاں آتا ہے۔ زیادہ تر شہر سے باہر ہی رہتا

ہے۔" وہ احتیاط سے سوئی میں دھاکہ دالتے ہوئے بولی

۔

"مگر کیوں؟" میں حیران ہوئی۔ جب سے میں آنی

تھی۔ کیف کا یہی معمول دیکھ رہی تھی۔ تاہم میں نے

ایک سے بھی نہیں پوچھا تھا کہ کیف کہاں جاتا ہے۔



"اب تو ان کے درمیان کوئی لڑائی نہیں؟" میں اپنی تسلی کے لیے پوچھ رہی تھی۔  
 "نہیں، بالکل بھی نہیں۔ ایک بھائی تو مرچا، بھی اور دل کے بھی بہت اچھے ہیں۔ کیف جذباتی اور فضا ور ہے۔ ہم ایک بھائی نے۔ کبھی بات نہیں بڑھتی؟"

وہ فراک سی پکی تھی۔ اب سلمان سمیٹ رہی تھی اور میں گہری سونہوں میں ڈوب ابھر رہی تھی۔ دراصل میرا ذہن ہی طرح سے الجھ چکا تھا۔  
 "آخر کیف نے مجھے کس مقصد کے لیے استعمال کیا ہے؟ مجھے ایک کے لیے پسند کرنا۔ جن میں میں اپنی بھاری جائیداد لکھو اٹا۔" میرا ذہن ایک نقطے پر ٹکڑھ چکا تھا۔ "بہر حال، پوچھی ہے۔ کیف تو ہم اپنے گھر والوں سے لے کر ایک تک سب کو دھوکا دے سکتا تھا۔ مجھے نہیں۔ میں یعنی سادی مراد اس کے جہل میں کبھی نہیں پھنس سکتی اور میرا یہ خود سے عہد تھا کہ اس سادی پانچک کی وجہ آخر جان کر ہی رہوں گی۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا تھا اور پھر مطمئن ہو گئی۔

\*\*\*

اس دن کی بات ہے، جب ایک کام کے سلسلے میں گھر سے باہر گیا تھا اور ٹھیک اسی شب کیف چلا آیا۔ اس کے انداز آج کافی بدلے بدلے لگ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا وہ کوئی فیصلہ کر کے آیا ہے۔ میں اس وقت لیٹن میں تھی اور وہ میرے پیچھے لیٹن میں ہی چلا آیا۔  
 "مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔" اس کا انداز چٹاؤ کھانے والا تھا۔ میری چٹھی جس نے فوراً مجھے چونکا دیا۔

"کون سی بات؟"

"میرے ساتھ آؤ۔" اس کے دھونس بھرے انداز نے مجھے بے حد غصہ دلایا تھا مگر میں ضبط کر گئی۔  
 "کہیں؟"

"بیٹھک میں۔" مجھے تم سے خدائی میں بات کرنا ہے۔"

"جو کرنا ہے، یہی کر دو۔" میں بھرے اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا تھا۔ پھر بڑے پراسرار انداز میں بولا۔  
 "میرے ساتھ ایکسٹریکٹ کر لو۔"

"کیسی ڈیل؟" اب اس کے میں جیج ٹھنک جاتی تھی۔ بات معمولی نوعیت کی نہیں تھی۔ میرا دل خوف کے مارے سکتے لگا۔  
 "یہ مگر تمہارے نام ہو چکا ہے اور ایک کی دو فریجنز بھی۔ تم ان کے کاغذات قانونی طور پر میرے نام کر دو۔" اس نے گویا بڑے اطمینان سے آگ پر پھول کے پھینکے پھینکے تھے۔

"کیا مطلب؟" میں چیخ اٹھی۔  
 "پچھلے وقت میری بات آرام سے سنو۔ میں نے یہ تمام کو غش میں اسی وجہ سے کی تھیں۔ مجھے ایک گاؤں تمہارا اہم جیٹا تھا اور پھر اپنا مقصد پورا کرنا تھا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ ہوسا کے ذریعے اپنے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچاؤں مگر پھر اپنی زندگی کی پہلی اور بدی خوشی کو کھو دینے کے خوف نے مجھے تم تک پہنچا دیا۔ میں یو سا کو ایک کے نکاح میں دے کر کوئی رسک نہیں

لے سکتا تھا۔ حالانکہ ہوسا کے ذریعے ایک کی ساری رہائی مجھے مل سکتی تھی۔ اب تو صرف اس گہری اور دو فریجنز کی بات ہے۔ بہر حال تم مجھے تمام کاغذات دے دو۔ عادی اس مٹائی کی ذمہ داری تم ہی پر ہوگی۔ میں تمہارے ارد گرد ایک جہل میں ہوں گا۔ تم اس جہل سے نکل نہیں پڑو گی۔"

وہ گویا زخمی مانی کی طرح پھٹکا رہا تھا اور میرے قدموں کے نیچے سے لٹن دھیرے دھیرے سرکے لگی تھی۔  
 "تم دھوکے باز ہو کیف، تم نے مجھے ہی نہیں مجھے بھائی کو بھی دھوکا دیا ہے۔ جس کے ساتھ تمہارا خون متعلق ہے۔ مجھے افسوس ہے تمہاری گہری ذہنیت پر لایچی پر ٹیکسٹ کی دکھانے پر۔" میں گویا ٹھیکے کے عالم میں پھٹ پڑی۔

"کچھ بھی کر لو۔ کاغذات تو تمہیں دینے ہی پڑیں گے۔" اس نے گویا آنکھیں میٹے پر رکھ لی تھیں۔  
 "اور اگر نہ ہوں تو؟"

"تو پھر اپنی جاتی کے لیے تیار ہو جانا۔ میں ایک کو صاف لفظوں میں بتا دوں گا کہ تم میری محبت میں گرفتار تھیں اور میرے مجبور کرنے پر تم ایک سے نکاح کرنے پر تیار ہوئی تھیں تاکہ ایک کی دولت ہم دونوں بٹھا لیں۔ تمہارے پاس موجود کاغذات تمہاری لالچی کے گواہ ہیں۔ ایک کو مزید یقین دلانے کے لیے میں تمہاری اور اپنی دو جتنی کاغذات بھی سنا دوں گا۔ ایک دو گواہ بھی پیش ہو جائیں گے۔ پھر تم کیا کر سکو گی؟"

وہ گویا استغناء سے مسکرا رہا تھا۔ میری بے وقوفی کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس نے مجھے ہی نہیں "ایک کے ساتھ بھی دھوکا کیا تھا اور نبھانے اس نے مزید کیا کچھ کرنا تھا۔ میرا دل خوف کے مارے پھر پھر ابھرتا تھا۔ میں نے خود کو کمزور بنا کر نہیں ہونے دیا۔

"میں تمہیں بھی بھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ یہ میرا خود سے وعدہ ہے۔ دھوکے باز اور فریبی لوگوں کو ان کے انجام تک پہنچا کر رہوں گی۔ تم نے رشتوں کے تقدس کا بھی خیال نہیں رکھا۔ کیا اتنے

سال کاٹ اور پونہ رتی میں یہی سیکھ رہے ہو؟"  
 "زیادہ بیڑ کر کے کی ضرورت نہیں۔ خوب سوچ سمجھ لو۔ ورنہ اپنی بھاری کے لیے تیار ہو جاؤ۔" کیف نے گویا آخری وار ٹھنک دی تھی۔

"تم ایسا کیوں کر کرنا چاہتے ہو۔ اگر جانید لو گاؤں، جھڑا سے تو ایک سے کہو اس میں بھلا میرا کیا قصور ہے۔"

میں گویا ٹھنک کر بولی تھی۔  
 "اگر وہ آرام سے لیٹ جاتا تو پھر مجھے اتنی بدی لانا تک کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ ہمارے حق پر قبضہ جما رکھا ہے۔ اور ہمیں اپنے کالہ پار میں جھٹکا دار ملازم رکھنا چاہتا ہے۔ ملٹی فنٹ! اس کی چاکری کرتی ہے میری جوتی۔ اسے ہر صورت مجھے برابر کا قصہ وار بنانا ہو گا ورنہ میں ہر حد سے گزر جاؤں گا۔" وہ باڈ کر بولا۔

"آہم سوری کیف! میں تمہاری بات نہیں مان سکتی۔ مجھے اپنے شوہر کا اعتبار اور مان عزیز ہے۔ میں اس کے اعتقاد خون نہیں کر سکتی۔" میرے دھوکہ فیصلہ کن انداز نے اسے ہلکا کر رکھا تھا۔ وہ مجھے دھمکیاں دے رہا تھا۔

"میں تمہیں ایک کی زندگی سے نکل بھیجوں گا۔" وہ غصے کے مارے کھٹ اڑا رہا تھا۔

اور پھر اس نے اپنا کامیاب کر دکھایا۔ وہ مجھے ایک کی زندگی سے باہر نکال دیا تھا۔ یہ اسی مان اعتبار اور اعتقاد کو بھاننے کا نتیجہ تھا جو میں اپنی ماں کے گھر واپس آگئی تھی۔ ایک نے کچھ زیادہ تو نہیں کہا تھا مگر اس کے چند الفاظ نے میرے جسم سے گویا جان تک نکل لی تھی۔

"مجھے دکھ ہوا ہے سادی! میرا دل اس وقت صدمے کے ذریعہ ہے۔ میں تمہارے ساتھ جاتی سے پیش نہیں آتا تھا۔" اسی کی پہلی جلاؤں پر باہر پھٹ کر آئے۔ اگر میں اس صدمے اور دکھ کی کیفیت سے کچھوٹا کر کے سنبھل گیا تو تمہیں لینے آجاؤں گا۔ ورنہ ہمارے راستے جدا ہیں۔ تم وہ کاغذات بھی ساتھ لے جاؤ۔ میں غصہ دے کر واپس لینے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

دھیما بھو، بھٹی آنکھیں اور ضبط کی سرخیوں سے سما چھوٹے اس نے نہ وضاحت طلب کی تھی اور نہ ہی مجھے خود سے دور کرنے کی وجہ بتائی۔ مگر میں جان تو چکی تھی کہ کیف کی خود غرضی اور کینکائی رنگ لے آئی ہے۔

میں نے اسی شب سلمان پانڈے کا قاتل اور غالی دل لے ایک کے گھر سے نکل آئی۔ اپنے پیچھے دائی "ملاؤ رونا" کی کو شہر اور روٹا پھوڑا کب مگر پورے ڈیڑھ بجتے بعد بھلا کیا ہوا؟

\*\*\*

"آپ۔" میں نے روئے برابر کر کے پیچھے مڑ کر دیکھا تو گویا پھر ہو گئی تھی۔ ایک میں میرے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ کب دے پڑوں گے میں داخل ہوا تھا۔ مجھے

تعلقہ سفر نہیں ہو سکی۔ اپنی سچ اور بڑی سوجھ بوش میں گم گھڑی کے سامنے گھڑے گھڑے میری باتیں گویا شل ہو کر رہ گئی تھیں۔

”ہاں نہیں۔ کیا ہمیں امید نہیں تھی کہ میں واپس آؤں گا۔“ وہ ہی مخصوص نرم اور دیمالہجہ میرے دل کی دھڑکنیں اول روز کی طرح بے ترتیب ہو گئی تھیں۔

”جس طرح مجھے گھر سے نکالا تھا۔ بھلا کوئی امید باقی رہ سکتی تھی کیا؟“ نہجانے کہاں سے ڈھیروں آنسو میری آنکھوں میں خود بخود اتر آئے تھے۔

”وہ وقت اور لمبے ہی کچھ ایسے تھے۔ ابھی تک اپنے ان الفاظ پر پچھتا رہا ہوں کہ میں بھی پہلا کیا کرتا؟“ کیف نے کہانی ہی کچھ اس طرح سے سنائی تھی کہ اس کے حرف حرف پر اعتبار آگیا۔ تم سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ یہی میری سب سے بڑی مثال تھی جس پر ابھی تک پشیمان ہوں۔ دو کچھ وہ بتا رہا تھا میری طرح کوئی بھی تو ہی ان باتوں کے چل میں پھنس سکتا تھا۔“ وہ سر جھکا کر دیکھی گوازیں کہ رہا تھا۔

”تپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“ میں ابھی لفظوں کو ترتیب دے رہی تھی جب ایک نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔

”پلیز سائی! پہلے میری بات سن لو۔ پھر جو کچھ کوئی میں سنتا رہوں گا۔ جو سزا سنو گی۔ مجھے منظور ہو گی۔“ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا تھا۔ گویا کہہ دینے یا نہ کہنے کے درمیان الجھ رہا تھا۔ پھر جب بولا تو گوازیں ہمیشہ والا گھبراؤ تھا۔

”بات کہاں سے شروع کروں۔ بہت پہلے سے“ جب میں چوبدری قوم کے آئین میں کیلئے والا پہلا پچہ تھا۔

پورے آٹھ سال تک میں پہلا اور آخری پچہ ہی رہا تھا اس دوران میرا کوئی اور بھائی اس دنیا میں نہیں آیا۔ میرے دادا کے لیے یہ بات خاص تشویش ناک تھی مگر انہوں نے مجھ پر ہی گویا صبر کر لیا تھا۔ ان کی مجھ

سے محبت کوئی دخل مجھے نہیں تھی۔ وہ مجھے اپنی زندگی کی دوا دے خوشی سمجھتے تھے۔ دراصل بات یہ تھی کہ میں گوتے والدین کی اولاد تھا۔ میری ماں اور باپ دونوں قوت گویائی سے محروم تھے۔ میرے لیاؤ دادا کی انگوٹھی اولاد تھے۔ ان کی زمینوں اور کارخانے کے اکلوتے تدارت۔

ان کے ہاں میں پہلا صحت مند بچہ پیدا ہوا تھا۔ میرے دادا کے لیے میری پیدائش بہت اہم کی دولت کے برابر تھی۔ انہوں نے نبی بھر کے میرے تازا اٹھائے تھے۔ مجھے بے تحاشا محبت سے نوازا تھا۔ میں ان کی محبت کے حصار میں خود کو پیشہ محفوظ سمجھتا تھا مگر یہ حصار تپ لوٹ کر بھر گیا جب میرے دادا اس دنیا سے چلے گئے مگر جانے سے پہلے وہ اپنی ساری جائیداد میرے ہاتھ کر گئے تھے اور ان کے چلے جانے کے بعد بیکے بعد دیگرے میرے چار اور بھائی پیدا ہو گئے۔ اور پھر ہمارے ابا بھائی سے بخار میں چل بسے۔ تب میں کافی سنبھل چکا تھا اور کچھ وقت کی سختیوں نے مجھے اچھی طرح سے ساری سبق پڑھا دیے تھے۔

میں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ کاروبار سنبھال لیا تھا۔ تب کیف بہت ناگھ اور نادان تھا اور میری نظر میں تو بالکل بچہ تھا۔ مجھے اپنی ماں اور بھائیوں سے بہت محبت تھی۔ اسی محبت نے مجھ سے بے تحاشا جدوجہد کروائی۔ میں نے اپنے قوت بازو پر اپنی محنت اور جدوجہد سے اپنا گھر بنایا تھا۔ چار فرمائز خریدیں۔ ایک دم سے سارا کچھ نہیں ہو گیا تھا۔ بے تحاشا محنت اور قربانیوں کے بعد میں اپنا ایک ہاتھ بنایا تھا۔

تب کیف بڑھنے کے لیے ہاسٹل میں مقیم تھا اور ما کی کسی کزن کے گھر بھی اس کا آنا جانا کرتا تھا۔ انہی کی بیٹی بچہ سے شادی کرنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ اس بات سے میں ابھی طرح واقف تھا مگر وہ کچھ یوں کہ ہماری رشتے کی اس خالہ نے یعنی بچہ ساکی ماں نے میرے خلاف کیف کے دل میں زہر بکھرا شروع کر دیا تھا۔

وہ چاہتی تھیں کہ کیف اپنے حصے کی جائیداد لوٹ کر ان کے پاس آجائے اور جب میں نے ایمان داری کے ساتھ قانونی طور پر اپنے چاروں بھائیوں کو دادا کی جائیداد کا حصہ دار بنایا تو ہم سب کے حصے میں تھوڑی تھوڑی سی برابری تھی۔ یہی بات ہماری خالہ کو بھڑکانی تھی۔ ان کی نظر میرے کاروبار پر بھی اور وہ چاہتی تھیں کہ میں اپنے بڑے میں سے بھی کیف کو حصہ دوں۔ ظاہر ہے میں نے انکار کر دیا تھا۔ بعد میں کیف مجھ سے بدگمان ہو گیا۔ میرے ساتھ جھگڑا رہا۔ بات خون خرابے تک آگئی تھی۔ میں کیف کو حصہ دار بنا بھی لیتا اگرچہ میں خالہ اور ان کی بیٹی نہ ہوتی۔

یہ مسئلہ ضد اور انا کا نہیں کیا تھا۔ میری اور کیف کی ناراضی چل رہی تھی۔ ایک دن وہ خود میرے پاس چلا آیا۔ اپنی کڑشتہ غلطیوں کی معافی مانگتا رہا تھا میں نے بھی کھلے دل سے اسے معاف بھی کر دیا۔ ہمارے صلے کی طرح تعلقات بحال ہو گئے تھے۔ مجھے نہیں خبر تھی کہ یہ سب ایک سازش اور منصوبے کی کڑی ہے۔

پھر ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ وہ چوبیسو کے بڑوں میں قیام پانچیر کیلے سے خاصی اندر اسٹینڈنگ رکھتا ہے اور ان کی بیٹی کو وہ میرے لیے پسند کر چکا ہے۔ ہمارے گھر میں کوئی عورت ایسی نہیں تھی جو ہمارے اس طرح کے معاملات نہ سنانے۔ فائر اور خون کی شادیوں کے تمام معاملات اسی نے ہی دیکھے تھے۔

اگرچہ فائر اور خون نے نو صیحت کی تھی۔ دوران تعلیم ہی دونوں پر شادی کا بہت سوار ہو گیا تھا۔ ہر حال جو بھی تھا حسن طریقے سے ان کی شادیاں ہو گئی تھیں۔

اما کی ساری ذمہ داریاں کیف نے ہی اٹھائیں۔ اوپر کیف نے مجھے جو کچھ ہمارے بارے میں بتایا تھا مجھے لگا تم میرے ہی بھائی کا ایک حصہ ہو۔ میرے دل نے ہمارے حق میں فیصلہ دے دیا تھا اور میں بطور دیکھے ہی تمہاری سادگی اور معصومیت کا سیر ہو گیا۔

میں جانتا تھا کہ ہماری ماں ایسے معاملات نہیں دیکھ

سکتی۔ جو کچھ کرنا تھا کیف نے ہی کرنا تھا اور وہ اپنی پانچھ کے تحت سب کچھ کر رہا اور میں اپنی سادگی میں اس سے بیٹھ دھوکا کھاتا رہا۔

شادی کے سلسلے میں ہونے والے اخراجات کے لیے جب رقم کم پڑ گئی تو وہ دوبارہ مجھ سے پیسوں کا مطالبہ کرنے لگا۔ اگر مجھے سمجھتا ہوتا تو میں تب ہی سمجھ جاتا کہ میں نے شک اور بدگمانی کو کسی دل میں جگہ نہیں دی تھی۔ پھر حق مرے طور پر اپنی ہماری جائیداد پر کیف کی ضد اور اصرار۔ میں حیران مضروب ہوا تھا مگر چونکا پھر بھی نہیں۔ میں غلامی کے سلسلے میں وہ ہی سب کچھ کر رہا ہوں۔ مجھ سے گوانا چاہتا تھا۔

میرے لیے سب سے بڑا انعام تم تھیں سادیہ! ایسا انعام جو مجھے کیف کے توسط سے ملا۔ میں تمہاری سادگی اور معصومیت کا سیر ہو گیا تھا۔ مجھے تم سے اور تمہارے خاص جذبوں سے بھرے دل سے محبت ہو گئی تھی۔ تب کیف نے سوچا کہ بازاری اسٹیج جاری ہے اور وہ اس بازی کو اپنے حق میں کرنے کے لیے بے صبری کا مظاہرہ کر رہا تھی تمہارے ساتھ وہ دو دھنگو کر کے ایسی دھنگو جو کسی سے من و عنہن نہ ہو سکی اور پھر مجھے بھی شادی۔ میں حیران ہوا ہوں کہ لوگ اپنے زرخیز دماغ کو لوگوں کے گھر اور دل اجازت دے کے کیسے استعمال کر لیتے ہیں۔

قصہ مختصر کہ میرے دل میں شک کی آگ جلا کر خود اپنے دل کو تیز کر کے کیا تھا مگر ہماری ملاپ کی اور خود غرض خالہ نے کل رات بچہ سا کو ایک کڑوٹی پیسہ سے بیاہ دیا اور کیف قوم کے دل پر گویا شام غریب باز تھی۔ اس صدمے میں وہ ہانپنے سے لگا رہا تھا۔ تڑوا بیٹھا۔ اوپر آنے میں اسی لیے دیر ہو گئی تھی کہ مجھے اس کے پیچھے ہسپتال جانا پڑا۔

دیکھو سادیہ! مجرم خود ہم دونوں کا ہے مگر میں نے اسے تمہاری طرف سے بھی معاف کر دیا ہے۔ کیا کروں، میری قوت گویائی سے محروم ماں بھول نہیں



سکتی مجھے علم نہیں دے سکتی۔ مگر اس کی آنکھوں کی  
الٹا کو لوٹنا میرے بس میں نہیں ہے اور میری دل کی  
خواہش ہے کہ جب میں واپس آؤں تو تم بھی میرے  
ساتھ ہو۔ کیا تم میری دل کی خواہش پوری کر دگی؟“  
وہ آنکھوں میں آنسو کے دہے سجائے شہر کھڑا  
تھ۔ میری ایک ہلنے اس کے چہرے کو تپا کی بخش  
دیا تھی۔ مگر میں بھی پورے ایک ہفتے کی ناراضی کا  
حساب لے بغیر اسے معاف نہیں کر سکتی تھی۔ اگرچہ  
ایک مجرم نہیں تھا۔ مجرم تو وہ تھا، بولاچی میں اور یو سا  
کے حصول کی خاطر خون کے رشتوں کو کھو دینے والا  
تھا۔ اب اس مجرم کو بھلا اور کیا سزا دی جانی تھی۔  
بے چارہ دل تروالے کے ساتھ ساتھ ٹانگ بھی خزا چکا  
تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسے اپنی غلطی کا  
احساس ہو گیا تھا۔ وہ پشیمان تھا، شرمندہ تھا۔ سو میں  
نے سوچا تھا کہ ایک پشیمان کو بھلا اور پشیمان نہ ہی کیا  
جائے تو بہتر ہے۔

مگر ایک کوسٹانے کا میں پورا پورا ارادہ رکھتی تھی۔  
سو اسی لیے خود ناراضی کا خول بڑھا لے بولی۔  
”میں آپ کو معاف نہیں کر سکتی ایک! آپ  
واپس چلے جائیں۔ میں اپنی انسلٹ نہیں قبول سکتی۔  
آپ نے بغیر وضاحت کے مجھے گھر سے کیوں نکالا؟“  
”مجھے معاف کر دو ساتھی! میں واقعی شرمندہ  
ہوں۔“ ایک میرے چہرے کے اثرات دیکھ کر گھبرا  
اٹھا۔ ہر صورت مجھے مٹانا چاہتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ  
ایک کو مٹانا آسانی کیل تھا اور ابھی وہ اسی سوچ میں گم  
تھا کہ مجھے کیسے مٹانے کہ اچانک دھاڑ سے دروازہ کھلا  
اور میں اور نیا گھر سے میں داخل ہو کر مجھ سے لپٹ  
گئیں۔

”ہم آپ کو زبردستی اٹھا کر لے جائیں گے بھابی!  
اللہ کی قسم“ آپ کے بغیر پورا گھر ویران ہو گیا ہے۔“  
کی اور نیا گھر لائی تو آواز میں کہہ رہی تھیں۔ میں نے  
اون دو نواں کی بے لوث محبت کو محسوس کرتے ہوئے  
ایک کو کھاتوہ معصوم صورت دیکھا کر بولا۔

”اللہ کی قسم! میرا دل اور کمر ابھی ویران ہے۔“  
میری نظر ایک کے چہرے سے ہٹ کر ایک اور چہرے  
سے اٹھ گئی تھی۔ یہ چہرہ لاکچو تھا مگر میں جانتی تھی کہ  
یہ خاموش آنکھیں اور او اس چہرہ کیا اٹھا کر رہا ہے۔  
مجھے اس کے لوٹ کر اس عورت کی خاموشی پر پیار آ گیا  
تھا۔

کچھ لوگ اس خاموشی کو پراسراریت سمجھتے تھے مگر  
میں جانتی تھی یہ پراسراریت نہیں۔ اس خاموشی میں  
ایک کی دل کا بھرم پوشیدہ ہے۔ آج بھی میرے گھر  
والے اس حقیقت سے بد واقف تھے۔ کوئی بھی نہیں  
جانتا تھا کہ سفینہ بیگم کیل خاموش رہتی ہیں اور نہ ہی  
میں نے کسی کو بتائے کی کوشش کی تھی کہ ملا خاموش  
کیوں ہیں۔ وہ قوت گویائی سے محروم ہیں۔

میری سوچتی ہوئی نظر نے اس کے ایک مرتبہ پھلکا  
کے پانچ چہرے کا طواف کیا تو ان کے چہرے کی اوجھا  
میرے دل پر گویا جا گئی۔

”ساتھی! چلو نا، میرا گھر اور میرے بچے کا دل بچ چک  
تمہارے بغیر ویران ہے۔“

میرے دل کو ایک دم کچھ ہونے لگا تھا اور میں  
بھاگ کر ملتا سے لپٹ گئی۔ بد گمانی کے ہاں چمٹ چکے  
تھے۔ دلوں پر جمی گرد صاف ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے  
گھر والوں اور ایک کے گھر والوں کے چہرے پر چمکی  
خوشی کو دل سے محسوس کیا تھا اور گویا گھل کر مسکرا  
دی۔

کالے عودے، سرخ سیاہ دلوں کے چپے کا منظر  
— خود بخود صاف ہو گیا تھا۔ اب ستاروں سے بھرا  
آسمان میرے سامنے تھا اور میں نے نکشلاؤں کی  
بارت کو اپنے گھر میں اترتے دیکھا اور مسکرائے گئی۔

